تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

ماہ نامہ

مفاہیم

کراچی

نومبر ۲۰۲۲ء

ماہنامہ مفاہیم کے دو سال پورے ہونے پر قارئین کو مبارک باد

جلد ۲

فقہ اکیڈمی کا ترجمان

شمارہ ۱۲

لیتفقہوا فی الدین

فقہ اکیڈمی

ليتفقهوا في الدين

ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگان محفوظ تر
اقبال

من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين

ماہ نامہ مفاہیم کراچی

فقہ اکیڈمی کا ترجمان | تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

سرپرستِ اعلیٰ

حضرت مولانا مفتی نذیر احمد ہاشمی صاحب مدظلہ

مدیر

صوفی جمیل الرحمن عباسی

نائب مدیر

مولانا حماد احمد ترک

مجلسِ مشاورت

- حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب
- ڈاکٹر محمد رشید ارشد
- مفتی اویس پاشا قرنی
- مولانا معراج محمد
- مولانا سید اسامہ علی
- مولانا ابرار حسین
- مولانا عابد علی بھٹی

فقہ اکیڈمی

C-335، بلاک-1، گلستان جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی، پاکستان۔ 3474 3662 21 92 + | 3474 3661 21 92 +

FIQHACADEMY.COM.PK   FIQHACADEMY   FIQHACADEMYPK   +92 330 3474223

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مضامین

نعت	سارے نبیوں کے عہدے بڑے ہیں	اقبؔال عظیم	۴
اداریہ	بہار ہے کہ خزاں	مدیر	۶
درسِ قرآن	اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے اوصاف	مولانا محمد اقبال	۱۰
درسِ حدیث	اللہ تعالیٰ کے نزدیک دو پسندیدہ کام	ابنِ عباس	۱۵
تنقیدِ مغرب	جامعہ بحریہ کے اساتذہ سے گفتگو (۱)	ڈاکٹر محمد رشید ارشد	۱۷
مقالات	جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے (۱)	مولانا حماد احمد ترک	۲۷
مقالات	ہوم اسکولنگ	مولانا امام رضا	۳۳
مقالات	بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۱۷)	صوفی جمیل الرحمان عباسی	۴۱
فقہیات	القواعد الفقهية: القاعدة الخامسة	مفتی نذیر احمد ہاشمی	۴۷
بِسُلوئک	پانچ موذی جانوروں کو مارنے والی حدیث کی وضاحت	دار الافتاء، فقہ اکیڈمی	۴۹
ادبیات	اقبالؔ اور کشمیر	شیخ علی محمد	۵۱
رحلات	افغان نامہ (۴)	مفتی اویس پاشا قرنی	۵۶

اقبال عظیم (۱۹۱۳ء۔۲۰۰۰ء)
معروف نعت گو شاعر

سارے نبیوں کے عہدے بڑے ہیں

سارے نبیوں کے عہدے بڑے ہیں، لیکن آقا کا منصب جدا ہے
وہ امامِ صفِ انبیا ہیں، اُن کا رتبہ بڑوں سے بڑا ہے

کوئی لفظوں سے کیسے بتا دے اُن کے رتبے کی حد ہے تو کیا ہے
ہم نے اپنے بڑوں سے سنا ہے، صرف اللہ اُن سے بڑا ہے

وہ جو اک شہرِ نور الہدیٰ ہے جلوہ گاہوں کا اک سلسلہ ہے
جس کی ہر صبح شمس الضحیٰ ہے، جس کی ہر شام بدر الدجیٰ ہے

نام جنت کا تم نے سنا ہے، میں نے اس کا نظارا کیا ہے
میں یہاں سے تمھیں کیا بتا دوں، اُن کی نگری کی گلیوں میں کیا ہے

کتنا پیارا ہے موسم وہاں کا، کتنی پُر کیف ساری فضا ہے
تم مرے ساتھ خود چل کے دیکھو، گردِ طیبہ بھی خاکِ شفا ہے

مستقل اُن کی چوکھٹ عطا ہو، میرے معبود یہ التجا ہے
کوئی پوچھے تو یہ کہہ سکوں میں، بابِ جبریل میرا پتا ہے

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

* * * * *

مدیر

ماہنامہ مفاہیم، کراچی

بہار ہے کہ خزاں

موسم سرما کی آمد آمد ہے۔ ہمارے موسموں کو دیکھنے کے انداز مختلف ہیں۔ بعض عوام بیچارے کپڑوں کو سوچتے، لنڈے کھوجتے ہیں۔ خواتین کو فراہمیٔ گیس کی چنتا ستاتی ہے تو ڈرائیور حضرات کو سی این جی کے لالے پڑتے ہیں۔ شاعر حضرات موسم کا تاثر کسی اور انداز میں لیتے ہیں۔ بعض کو ''یونہی موسم کی ادا دیکھ کہ'' یاد آتا ہے کہ انسان کس سرعت سے بدلتا ہے، بعض روتے روتے چیخ اٹھے: ''اُس نے دور ہونا تھا بارشوں کے موسم میں؟'' اور بعض اِس طرح کے کام کرنے والے، خود کو یوں ملامت کرتے ہیں کہ ''اب اداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں'' اور بعض ایسے درویش بھی ہوتے ہیں جو مواسم کے ظواہر و مظاہر سے قطع نظر اپنے اندر ایک موسم سجا لیتے ہیں:

نہ کوئی غم خزاں کا ہے نہ خواہش ہے بہاروں کی
ہمارے ساتھ ہے امجد کسی کی یاد کا موسم

انسان اگر حریم ذات سے نکل کر، دیوار جاں توڑ کر، اپنی ہستی کو ذرا بھول کر دیکھے تو ہجر و وصال کے پیچھے بہتیرے موسم اور بھی ہیں:

کتنے موسم سرگرداں تھے مجھ سے ہاتھ ملانے میں
میں نے شاید دیر لگا دی خود سے باہر آنے میں

یہ تو موسم والوں کا معاملہ تھا، موسم والے، موسموں کو دیکھتے رہتے ہیں لیکن ''اللہ والے'' ہر موسم کے پیچھے ''موسم

گر"کو دیکھتے ہیں۔ تو اللہ والے؛ موسموں کو ایک دوسرے ہی انداز سے دیکھتے ہیں۔ مثلاً بارش ہی کو لے لیں: اللہ کے نبی ﷺ جب اسے پاتے تو اپنے کپڑوں پر لے لیتے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے وجہ پوچھی تو فرمایا:« لِأَنَّهُ حَدِيثُ عَهْدٍ بِرَبِّهِ تَعَالَى» "اس لیے کہ یہ اپنے رب تعالیٰ کے پاس سے ابھی ابھی آئی ہے"۔(صحیح مسلم) تو دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے والا دل اگر اللہ والا ہو گا تو وہ موسم سرما ہو یا گرما، ہر ایک کو دوسری طرح سے دیکھے گا جیسا کہ اللہ کے نبی ﷺ نے دکھلایا:«اِشْتكَتِ النَّارُ إِلَى رَبِّهَا، فَقَالَتْ: يَا رَبِّ أَكَلَ بَعْضِي بَعْضًا، فَجَعَلَ لَهَا نَفَسَيْنِ: نَفَسٌ فِي الشِّتَاءِ، وَنَفَسٌ فِي الصَّيْفِ، فَشِدَّةُ مَا تَجِدُونَ مِنَ الْبَرْدِ مِنْ زَمْهَرِيرِهَا، وَشِدَّةُ مَا تَجِدُونَ مِنَ الْحَرِّ مِنْ سَمُومِهَا» "دوزخ نے اپنے رب کو شکایت کہ اے رب میرے حصوں نے خود ایک دوسرے کو کھانا شروع کر دیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے دوزخ کو دو سانس بھرنے کی اجازت دے دی، ایک سانس گرمیوں میں اور ایک سانس سردیوں میں، پس تم جو سردی کی شدت پاتے ہو تو وہ دوزخ کے ٹھنڈے عذاب (زمہریر) کی وجہ سے ہے اور جو تم گرمی کی شدت پاتے ہو وہ دوزخ کے گرم عذاب (سموم) کے سبب ہے"۔(متفق علیہ) دیکھیے ہمارے پیغمبر ﷺ نے گرمی اور سردی دونوں میں دوزخ کو یاد کرا دیا۔ تو دوزخ میں عذاب گرمی کا بھی ہے اور سردی کا بھی اور دنیا کے موسم سرد بھی ہیں اور گرم بھی، پس دونوں موسموں میں دوزخ سے نجات اور جنت کی فوز و فلاح کے لیے محنت کرتے رہنے کی ضرورت ہے:

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں، لا الٰہ الا اللہ

اللہ کے بہترین بندوں کی صفت بھی کچھ ایسی ہی بیان کی گئی کہ وہ:«يُرَاعُونَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ وَالْأَظِلَّةَ لِذِكْرِ اللهِ» "وہ ذکرُ اللہ کی غرض سے، سورج، چاند تاروں اور سایوں کی مناسبت تلاش کرتے رہتے ہیں"۔(مستدرک حاکم) رسول اللہ ﷺ نے نماز ظہر کے تذکرے میں ارشاد فرمایا:« إِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ فَأَبْرِدُوا بِالصَّلَاةِ فَإِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ» "جب گرمی شدت اختیار کر جائے تو نماز کو ٹھنڈا کیا کرو، کیونکہ گرمی کی شدت دوزخ کی ہوا کے سبب

ہے"۔(صحیح مسلم)اس حدیث میں بیان تو گرمیوں کے موسم میں کسی قدر تاخیر ظہر کا ہے لیکن دوزخ کی گرمی اور نماز کے ٹھنڈے کرنے کے ذکر سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ آتشِ جہنم سے بچاؤ نماز اور دیگر اعمال کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ جبھی تو جنت و مغفرت کی دعاؤں کی درخواست کرنے والوں کو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اعمال کی طرف متوجہ کیا، ملاحظہ فرمائیں چند مثالیں:«فَأَعِنِّي عَلَى نَفْسِكَ بِكَثْرَةِ السُّجُودِ» "پس تو (اس قبولیتِ دعا میں)، اپنے نفس کے خلاف، کثرتِ سجود کے ذریعے میری مدد کر"«عَلَيْكَ بِكَثْرَةِ السُّجُودِ لِلَّهِ» "سجدوں کی کثرت (یعنی نماز) کو خود پر لازم کرلو"۔«عَلَيْكَ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَا مِثْلَ لَهُ» "تو روزے کو لازم پکڑ لے کہ اس جیسا کوئی عمل نہیں ہے"۔(صحیح مسلم و مسند احمد)

ان مثالوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ چوٹی کے دو اعمال روزہ اور نماز کا ذکر کیا گیا تو موسمِ سرما کی آمد آمد پر سوچ لینا چاہیے کہ اعمال کے لیے، بلکہ نماز اور روزے دونوں کے لیے یہ ایک بہترین موسم ہے اتنا بہترین کہ ہمارے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے اسے خزاں کے بجائے بہار قرار دیتے ہوئے فرمایا:«الشِّتَاءُ رَبِيعُ الْمُؤْمِنِ»(مسندِ احمد)"موسمِ سرما مومن کے لیے تو موسمِ بہار ہے"۔ایک حدیث میں آتا ہے:«الشِّتَاءُ رَبِيعُ الْمُؤْمِنِ، قَصُرَ نَهَارُهُ فَصَامَ، وَطَالَ لَيْلُهُ فَقَامَ» "موسمِ سرما مومن کے لیے بہار کی مانند ہے، اس کے دن چھوٹے ہیں پس انسان روزہ رکھ سکتا ہے اور اس کی راتیں لمبی ہیں انسان آسانی سے قیام کر سکتا ہے"۔(شعب الایمان)

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین بھی موسمِ سرما کو غنیمت سمجھتے رہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے:الشِّتَاءُ غَنِيمَةُ الْعَابِدِينَ "سردیوں کا موسم تو عبادت گزاروں کا موسمِ غنیمت ہے"۔(حلیۃ الاولیاء) سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، موسم سرما کی آمد پر فرمایا کرتے تھے: مَرْحَبًا بِالشِّتَاءِ فِيهِ تَنْزِلُ الْبَرَكَةُ أَمَا لَيْلُهُ فَطَوِيلٌ لِلْقِيَامِ وَأَمَّا نَهَارُهُ فَقَصِيرٌ لِلصِّيَامِ "جاڑے کو خوش آمدید کہ اس میں برکت کا نزول ہوتا ہے، اس کی لمبی راتیں قیام کے لیے ہیں اور چھوٹے دن صیام کے لیے ہیں"۔(حلیۃ الاولیاء) مشہور تابعی عبید بن عمیر رحمہ اللہ آمدِ سرما پر اہلِ قرآن سے فرمایا کرتے تھے: قَدْ طَالَ اللَّيْلُ لِقِرَاءَتِكُمْ فَاقْرَأُوا، وَقَصُرَ النَّهَارُ لِصِيَامِكُمْ فَصُومُوا "رات تمھاری تلاوت

کے لیے لمبی ہوئی ہے پس قرآن پڑھا کرو اور دن روزہ رکھنے کے لیے چھوٹا ہوا ہے پس روزہ رکھا کرو"۔(حلیۃ الاولیاء) امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے: نِعْمَ زمانُ المؤمنِ الشتاءُ لیلُه طویلٌ یقومُه و نَهارُه قصیرٌ یصومُه "کیا ہی خوب زمانہ ہے مومن کے لیے سرما کا، اس کی رات لمبی ہے اور وہ اس میں قیام کرتا ہے اور اس کے دن چھوٹے اور وہ روزہ رکھ لیتا ہے"۔(حلیۃ الاولیاء)

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے سردیوں کے موسم میں روزے رکھنے کو ٹھنڈی غنیمت قرار دیتے ہوئے فرمایا:«الصَّوْمُ فِي الشِّتَاءِ الْغَنِيمَةُ الْبَارِدَةُ» "سردیوں میں روزہ رکھنا ٹھنڈی غنیمت ہے"۔(سلسلہ الاحادیث الصحیحہ) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ فرمایا: کیا میں تمھیں ٹھنڈی ٹھار غنیمت کے بارے میں نہ بتاوں؟ سامع نے کہا: حضرت! وہ کیا چیز ہے فرمایا: الصَّوْمُ فِي الشِّتَاءِ "سردیوں میں روزے رکھنا"۔(السنن الکبری، بیہقی)

* * * * *

مولانا محمد اقبال
رکن شعبہ تحقیق و تصنیف

اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے اوصاف

سورہ الفرقان آیت: ٦٤تا٦٦

﴿وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِم سُجَّدًا وَّقِيَامًا، وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا اصرِف عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ، إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا، إِنَّهَا سَاءَت مُستَقَرًّا وَّمُقَامًا﴾

''اور جو راتیں اس طرح گزارتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے آگے (کبھی) سجدے میں ہوتے ہیں، اور (کبھی) قیام میں۔ اور جو یہ کہتے ہیں کہ: ہمارے پروردگار! جہنم کے عذاب کو ہم سے دور رکھیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا عذاب وہ تباہی ہے جو چمٹ کر رہ جاتی ہے۔ یقیناً وہ کسی کا مستقر اور قیام گاہ بننے کے لیے بدترین جگہ ہے''۔

تفسیر و توضیح

سورۂ فرقان کی آیت نمبر تریسٹھ سے اسی سورت کے آخر تک کی آیات میں اللہ جل شانہ نے اپنے خاص بندوں کے وہ خصوصی اوصاف بیان فرمائے ہیں، جو ان کے نزدیک پسندیدہ اور محبوب ہیں اور ان اوصاف کی بدولت اللہ تعالیٰ کے بعض بندے امتیازی مقام پر فائز ہیں۔ یہ وہ اوصاف ہیں جنھیں اپنے معمول کا حصہ بنانے اور ان کو اختیار کرنے سے ایک بندہ ''عباد الرحمٰن'' کے عظیم لقب کا مستحق ٹھہرتا ہے، یہ کل گیارہ اوصاف ہیں۔ ان میں سے پہلے دو اوصاف ہم آیت نمبر تریسٹھ کے ذیل میں ملاحظہ کر چکے ہیں جبکہ باقی اوصاف میں سے مزید دو اوصاف کو حسبِ بالا مذکورہ آیات کے مطالعے کے ضمن

میں ذکر کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ

قیام اللیل یعنی تہجد کا اہتمام

اللہ تعالیٰ کے ان نیک اور صالح بندوں کے وہ عظیم اوصاف جن کی بنا پر یہ دیگر بندوں سے بلند تر ہیں، ان میں سے تیسرا مہتم بالشان وصف قیام اللیل یعنی تہجد کا اہتمام ہے، چنانچہ یہاں فرمایا گیا ہے: ﴿وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا﴾ ''اور جو راتیں اس طرح گزارتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے آگے (کبھی) سجدے میں ہوتے ہیں، اور (کبھی) قیام میں''۔ یعنی رات کی گھڑیوں میں جب تنہائی ہو، سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کے سامنے عبادت کرنے کا شائبہ بھی دل میں نہ گذرے، ایسے وقت میں تہجد کا اہتمام کرنا بندۂ مومن کی اللہ تعالیٰ سے محبت اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل ایمان کی دلیل ہے۔ چنانچہ مذکورہ آیت میں ان خاصانِ خدا کی راتوں کی کیفیت اور نقشہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ وہ راتیں اس طرح گزارتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے آگے کبھی سجدے میں ہوتے ہیں اور کبھی قیام میں ہوتے ہیں۔ یعنی ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی جو محبت ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ محبت انھیں رات کے وقت سونے نہیں دیتی، بلکہ وہ اپنے رب کے سامنے نمازوں میں دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں اور اپنے پروردگار کے در پر سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے ایک اور مقام پر ان کا نقشہ یوں کھینچا ہے: ﴿تَتَجَافٰى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنفِقُونَ، فَلَا تَعلَمُ نَفسٌ مَّا أُخفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعيُنٍ، جَزَآءً بِمَا كَانُوا يَعمَلُونَ﴾ (سورہ السجدۃ آیت: ۱۶۔۱۷) ''ان کے پہلو (رات کے وقت) اپنے بستروں سے جدا ہوتے ہیں، وہ اپنے پروردگار کو ڈر اور امید (کے ملے جذبات) کے ساتھ پکار رہے ہوتے ہیں اور ہم نے ان کو جو رزق دیا ہے، وہ اس میں سے (نیکی کے کاموں میں) خرچ کرتے ہیں۔ چنانچہ کسی متنفس کو کچھ پتا نہیں ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک کا کیا سامان ان کے اعمال کے بدلے میں چھپا کر رکھا گیا ہے''۔ اس آیت کی رو سے ایسے نیک لوگوں کے لیے جو تہجد کی نماز کا اہتمام کرتے ہیں، ان کے لیے پروردگارِ عالم کے ہاں جو نعمتیں تیار کی گئی ہیں وہ انسان کے تصور سے بھی بلند ہیں۔ احادیثِ مبارکہ میں بھی تہجد کی نماز پڑھنے کے بے شمار فضائل وارد ہوئے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی

اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَفْضَلُ الصِّيَامِ بَعْدَ شَهْرِ رَمَضَانَ شَهْرُ اللهِ الْمُحَرَّمُ وَأَفْضَلُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الْفَرِيضَةِ صَلَاةُ اللَّيْلِ» (جامع ترمذی، حدیث نمبر:۴۳۸) ''رمضان کے بعد سب سے افضل روزے اللہ کے مہینے محرم کے روزے ہیں اور فرض نماز کے بعد سب سے افضل نماز رات کی نماز (تہجد) ہے''۔ اسی طرح ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: «لَا تَدَعْ قِيَامَ اللَّيْلِ، فَإِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ لَا يَدَعُهُ، وَكَانَ إِذَا مَرِضَ أَوْ كَسِلَ صَلَّى قَاعِدًا» (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر:۱۳۰۷) ''تہجد (قیام اللیل) نہ چھوڑو کیونکہ رسول اللہ ﷺ اسے نہیں چھوڑتے تھے، جب آپ بیمار یا تھکے ہوئے ہوتے تو بیٹھ کر پڑھتے تھے''۔ قرآن و سنت میں قیام اللیل کی دوسری نفلی نمازوں کے مقابلے میں اتنی زیادہ فضیلت بیان ہونے کی وجہ یہ ہے کہ باقی نمازوں میں ریا کا امکان پایا جاتا ہے جبکہ اس اہم عبادت میں سرے سے یہ امکان ہی نہیں پایا جاتا بلکہ یہاں سر تا سر اخلاص ہی کی فرماں روائی ہے۔ اسی طرح رات کے اوقات میں چونکہ خاموشی طاری ہوتی ہے، اس خاموشی اور تنہائی میں محبوبِ حقیقی کے ساتھ راز و نیاز میں منہمک رہنے اور اس کے حضور کھڑے ہو کر گڑگڑانے میں دن کی نسبت استحضار اور خشوع و خضوع کا اہتمام زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ علامہ زحیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اَلصِّفَةُ الثَّالِثَةُ: اَلتَّهَجُّدُ لَيْلًا: أَيِ الْعِبَادَةُ الْخَالِصَةُ لِلّٰهِ تَعَالىٰ فِي جَوْفِ اللَّيْلِ، فَإِنَّهَا أَكْثَرُ خُشُوْعًا، وَ أَضْبَطُ مَعْنًى، وَ أَبْعَدُ عَنِ الرِّيَاءِ. (التفسير المنير في العقيدة والشريعة والمنهج، ج:۱۹، ص:۱۱۴) ''عباد الرحمٰن کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ تہجد کا اہتمام کرتے ہیں، یہ رات کے وقت میں ایسی عبادت ہے جو خالص اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ خشوع کے اعتبار سے بڑھی ہوئی ہے، ضبطِ معنوی پیدا کرنے میں اکسیر ہے اور ریا سے پاک ہے''۔ یعنی تہجد کی نماز میں خشوع و خضوع، استحضارِ قلب کے ساتھ اخلاص کا یہ عالم ہے کہ یہاں ریا اور سمعہ کا گزر نہیں ہے، ان خصوصیات کی بنا پر یہ نماز دیگر نوافل کی بنسبت زیادہ فضیلت کی حامل ہے۔ البتہ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ تہجد کی نماز کی جتنی بڑی فضیلتیں ہیں، اسی طرح اس کے چند آداب بھی ہیں جنھیں عام طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ نماز فرض یا واجب نہیں ہے، بلکہ سنت ہے، اس لیے اسے فرض یا واجب کے درجے تک لے جانا اور جو نہ پڑھے

اسے ہدفِ ملامت بنانا درست نہیں ہے، اسی طرح اس بات کا خیال رکھنا بھی از حد ضروری ہے کہ جب کوئی شخص اس نماز کے لیے اٹھے تو اپنے گھر والوں کے آرام میں خلل نہیں ڈالنا چاہیے، کیونکہ تہجد پڑھنا باعثِ ثواب ضرور ہے مگر ایذائے مسلم سے بچنا بہرحال واجب ہے، اس لیے طاعات میں فرقِ مراتب کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

عباد الرحمٰن جہنم کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں

عباد الرحمٰن کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اپنی نیکی پر کوئی فخر نہیں کرتے، رات بھر عبادت میں مشغول رہنے کے بعد بھی وہ اپنے اعمال پر مغرور نہیں ہوتے اور نہ ہی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم تو بخشے بخشائے ہیں۔ بلکہ اُن کو ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ ہماری عبادات میں ایسی کوتاہیاں ضرور ہم سے سرزد ہوئی ہوں گی جن کی وجہ سے وہ عبادات خدا نخواستہ اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کرنے کے لائق ہی نہ ہوں۔ لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی ہولناکیوں سے پناہ مانگتے رہتے ہیں، چنانچہ ان کا وصف یہ بیان کیا گیا ہے کہ:﴿وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا اصرِف عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ، إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا، إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا﴾ ’’اور جو یہ کہتے ہیں کہ: ہمارے پروردگار! جہنم کے عذاب کو ہم سے دور رکھیے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا عذاب وہ تباہی ہے جو چمٹ کر رہ جاتی ہے۔ یقیناً وہ کسی کا مستقر اور قیام گاہ بننے کے لیے بدترین جگہ ہے‘‘۔ یعنی وہ ہر وقت میں اپنے پروردگار سے جہنم کی ہولناکیوں سے حفاظت کی دعا کا اہتمام کرتے ہیں، کیونکہ انھیں احساس ہے کہ جہنم ایسی جائے قرار ہے جہاں سوائے رسوائی اور ہلاکت خیزی کے کچھ نہیں ہے۔ یہ تو در حقیقت ایسی جگہ ہے کہ اسے مستقل جائے قرار بنانا تو دور کی بات ہے بلکہ اسے تو تھوڑی دیر کے لیے بھی جائے قیام بنانا ممکن نہیں ہے، کیونکہ اس کی ہولناکیاں اور سختیاں برداشت کرنا کسی فردِ بشر کے بس کی بات نہیں ہے۔ لہٰذا ’’عباد الرحمٰن‘‘ کے اوصاف میں سے ایک اہم وصف یہ بھی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے ہیں اور اس سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ علامہ زحیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:اَلصِّفَةُ الرَّابِعَةُ: اَلْخَوْفُ مِنْ عَذَابِ اللهِ تَعَالىٰ: أَيْ أَنَّهُمْ مَعَ طَاعَتِهِمْ مُشْفِقُوْنَ خَائِفُوْنَ وَجِلُوْنَ مِنْ عَذَابِ اللهِ، سَوَآءً فِي سُجُوْدِهِمْ وَ قِيَامِهِمْ لِأَنَّ عَذَابَ جَهَنَّمَ لَازِمٌ دَائِمٌ غَيرُ مُفَارِقٍ، وَ بِئْسَ الْمُسْتَقَرُّ، وَ

بِئْسَ الْمُقَامُ.(التفسير المنير في العقيدة والشريعة والمنهج،ج:۱۹،ص:۱۱۵) ”عبادالرحمٰن کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے ہیں، یعنی وہ طاعات کی پابندی کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے لرزاں وترساں رہتے ہیں، خواہ سجدے کی حالت میں ہوں یاقیام کی حالت میں ہوں۔اس لیے کہ جہنم کا عذاب مسلسل چمٹنے والا اور دائمی ہے اور یہ مستقل (کافروں)اور عارضی قیام (گناہ کار مسلمین) دونوں کے لیے بہت ہی براٹھکانا ہے“۔

* * * * *

ابنِ عباس
معاونِ قلم کار

اللہ تعالیٰ کے نزدیک دو پسندیدہ کام

عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «عَجِبَ رَبُّنَا مِنْ رَجُلَيْنِ:

''حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ دو بندوں پر بہت خوش ہوتا ہے:

رَجُلٌ ثَارَ (فِي لَيْلَةٍ بَارِدَةٍ) عَنْ وِطَائِهِ وَلِحَافِهِ مِنْ بَيْنِ حِبِّهِ وَأَهْلِهِ إِلَى صَلَاتِهِ فَيَقُولُ اللهُ لِمَلَائِكَتِهِ:

ایک وہ آدمی جو (سردی کی رات میں) اپنے بستر اور لحاف سے نکلے اور اپنے محبوب اہل و عیال کے درمیان سے اٹھ کر نماز پڑھنے لگے تب اللہ تعالیٰ فرشتوں سے کہتا ہے:

أُنْظُرُوا إِلَى عَبْدِي ثَارَ عَنْ فِرَاشِهِ وَوِطَائِهِ مِنْ بَيْنِ حِبِّهِ وَأَهْلِهِ إِلَى صَلَاتِهِ رَغْبَةً فِيمَا عِنْدِي وَشَفَقًا مِمَّا عِنْدِي.

دیکھو میرے اس بندے کو اس نے میرے انعام کے حصول اور میرے عذاب سے محفوظ رہنے کے لیے، اپنے بستر اور لحاف کو چھوڑا اور اپنے محبوب اہل و عیال سے الگ ہو کر نماز میں لگ گیا۔

وَرَجُلٌ غَزَا فِي سَبِيلِ اللهِ فَانْهَزَمَ مَعَ أَصْحَابِهِ فَعَلِمَ مَا عَلَيْهِ فِي الِانْهِزَامِ وَمَا لَهُ فِي الرُّجُوعِ فَرَجَعَ حَتَّى هُرِيقَ دَمُهُ

اور دوسرا بندہ وہ ہے جس نے اللہ کے راستے میں جہاد کیا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے جنگ میں شکست ہوگئی، لیکن راہِ فرار اختیار کرنے کے گناہ سے بچنے اور ثابت قدم رہنے پر ملنے والے اجر کی امید پر وہ مقابلے میں ڈٹا رہا یہاں تک کہ (راہِ وفا

میں)اس کا خون بہادیا گیا

فَيَقُولُ اللهُ لِمَلَائِكَتِهِ: انْظُرُوا إِلَى عَبْدِي رَجَعَ رَغْبَةً فِيمَا عِنْدِي وَشَفَقًا مِمَّا عِنْدِي حَتَّى هُرِيقَ دَمُهُ».

تواس موقعے پر اللہ تعالیٰ فرشتوں سے کہتا ہے: میرے بندے کو دیکھو، یہ میرے انعام کے شوق اور میری سزا کے خوف کے سبب جنگ میں لگا رہا یہاں تک اس نے اپنا خون بہادیا"۔(صحیح ابن حبان)

اس حدیث شریف میں دو اعمال کا بیان ہے: ایک نمازِ تہجد، جو انتہائی مشقت والا عمل ہے۔ نیند اور آرام دہ بستر کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑا ہونا اور اس سے راز و نیاز کرنا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ دوسرا جہادِ فی سبیل اللہ میں استقامت و جرات کا مظاہرہ۔ اللہ کے راستے میں اپنا گھر بار اور اپنے اہل و عیال کو چھوڑ کر مصائب اور مشکلات جھیلتے ہوئے باطل سے ٹکرانا اور اپنی جان کی بازی لگا دینا واقعتاً بہت مشکل کام ہے۔ ان دونوں کاموں کو اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا اور خاص طور پر فرشتوں سے مخاطب ہو کر ان کا تذکرہ کیا۔ دعا ہے کہ ہم سب کو نمازِ تہجد کی توفیق اور قیام اللیل کی حلاوت نصیب ہو، اور وقت آنے پر جہاد و قتال کے لیے نکلنا نصیب ہو، آمین۔

*****

گفتگو: ڈاکٹر محمد رشید ارشد

ٹرانسکرپشن: دانیال بن شفیق

جامعہ بحریہ کے اساتذہ سے گفتگو (۱)

شعبہ اسلامی علوم، جامعہ بحریہ، کراچی، کے اساتذہ سے گفتگو، جسے ضبط و ترتیب کے بعد قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے

Rudyard Kipling لٹریچر کا آدمی ہے، اُس کی ایک نظم ہے جس کا ایک جملہ بڑا مشہور ہے: East is East, and West is West, and never shall the twain meet، مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب ہے اور یہ دونوں مل نہیں سکتے۔ کل ہی ایک مجلس میں سلیم احمد، کراچی کے بہت مشہور شاعر تھے، دانشور بھی تھے، ڈرامہ نگار بھی تھے اُن کی ایک طویل نظم سننے کا اتفاق ہوا "مشرق ہار گیا ہے"۔ اُس کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے کہ مشرق ہار گیا ہے اور مغرب نے کیسے influence کیا ہے مشرق کو تو وہ غیر معمولی چیز ہے، اس آزاد نظم کے ابتدائی چند مصرعے یہ ہیں:

کِپلنگ نے کہا تھا:

"مشرق مشرق ہے

اور مغرب مغرب ہے

اور دونوں کا ملنا ناممکن ہے"

لیکن مغرب مشرق کے گھر آنگن میں آپہونچا ہے

میرا نوکر بی بی سی سے خبریں سنتا ہے

میں بیدلؔ اور حافظؔ کے بجائے

شیکسپیئر اور رلکے کی باتیں کرتا ہوں

ہمارے ہاں بھی چونکہ آپ کو پتا ہے کہ مغربی فکر یا مغربی طرزِ زندگی یا اِس کو جدیدیت بھی کہا جاتا ہے، وہ آئی ہے ایک طرح سے gun point پر یعنی یہ تہذیبوں کے درمیان، قوموں کے درمیان ثقافتی، علمی، تہذیبی لین دین چلتا رہتا ہے، ایک دوسرے سے ہم لین دین کرتے ہیں لیکن ہمارے ساتھ تو جو ہوا ہے، وہ جبر کے ساتھ ہوا ہے اور ہم سے مراد ہے، امتِ مسلمہ۔ اور آپ دیکھیں نا جب بھی ہمارے ہاں پڑھے لکھے لوگوں میں گفتگو ہوتی ہے کہ بھئی ہم امتِ مسلمہ پچھڑ کیوں گئی؟ پیچھے کیوں رہ گئی؟ کیونکہ ایک belated consciousness کا ایک احساس ہے نا کہ ہم پیچھے رہ گئے اور ایک جیسے catching up syndrome کا شکار ہیں ہم، کہ ہمیں کسی طریقے سے catch up کرنا ہے مغرب کے ساتھ یعنی وہ آگے آگے بھاگ رہے ہیں، ہم اُن کے پیچھے پیچھے جا رہے ہیں، اُس میں ایک سوال کیا جاتا ہے Pervez Hoodbhoy کی ایک کتاب ہے، میرے خیال سے eighty's میں چھپی تھی: Islam and Science تو یہاں ایک سوال اٹھایا جاتا ہے کہ بھئی جو enlightenment ہے، یہ مسلم امت میں کیوں نہیں آئی؟ اور روشن خیالی کی تحریک تھی تو یہ یہاں کیوں نہیں آئی؟ یا ہم سے یہ ترقی کی بس کیوں چھوٹ گئی؟ اور ہم زوال کا شکار کیوں ہوئے؟ آپ کو معلوم ہے؟ پورا ایک افسانہ ہے عروج و زوال کا کہ جی ہم بہت عروج پر تھے پھر ہم زوال کا شکار ہو گئے، پہلے مغرب جو ہے، وہ زوال کا شکار تھا، اب وہ عروج پر ہے بلکہ علامہ اقبال کی شاعری میں بھی اِس کی طرف اشارہ ہے، اُن کے خطبات میں بھی اشارہ ہے کہ جدید مغرب کی تشکیل میں مسلمانوں کا بہت حصہ ہے یعنی جو early renaissance ہے، اُس کے بارے میں کہا جاتا ہے نا کہ بھئی وہ تو اپنی تُراث سے لاتعلق ہو گئے تھے medieval age میں، Christian era میں اور ہر چیز پر جیسے ایک sacred canopy تھی اور زندگی کے سارے شعبے مذہب کی چھت و چھایا میں ہو رہے تھے اور Church کی اور Pop کی hegemony تھی اور وہاں کے کچھ لوگوں کا یہ خیال بھی تھا کہ philosophy became the handmaiden of theology، فلسفہ جو ہے، وہ الٰہیات کی باندی بن کے رہ گیا تھا تو یہ جو کہتے ہیں کہ renaissance میں ہم نے اپنی رومی اور یونانی جو تراث ہے، اُس کی ہم نے بازیافت کی ہے اور چونکہ وہ کہا کرتے تھے کہ بھئی ہماری یہ دو origins ہیں، جو ہمارا

ذہن ہے، جو ہماری فکر ہے، جو ہمارے تصورات ہیں، اُس کا origin یونان ہے اور جو ہمارا عمل ہے، ہمارا قانون ہے، ہماری سلطنت ہے، وہ مغرب سے ملی ہے، ٹھیک ہے نا یعنی آج بھی آپ دیکھیں: Michel Foucault ایک بہت مشہور French Thinker ہے، اُس نے یہ بات کہی ہے، اور بہت سے لوگوں نے بھی یہ بات کی ہے کہ بھئی دو ہی چیزیں ہیں اصل میں جو قوموں کے عروج وزوال کو طے کرتی ہیں، وہ ہیں Knowledge and Power، گویا مغرب والوں نے یہ کہا کہ ہمارا knowledge جہاں سے آیا ہے، وہ Greek سے ہے، Greek thought یا philosophy ہے اور ہماری power کا جو structure ہے، وہ Roman Empire سے آیا ہے۔ تو میں بتا یہ رہا تھا کہ مسلمانوں نے اُن کے اِن علوم کی بازیافت میں حصہ ڈالا ہے، جب Spain میں مسلمانوں کی حکومت تھی، وہاں کی universities میں، قرطبہ اور غرناطہ کی یونی ورسٹیوں میں پورے Europe سے لوگ جاتے تھے اور پڑھتے تھے، تب بہت سی یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا گیا، تو پھر گویا Europe کے لوگوں نے، جو عیسائی تھے، اُنھوں نے بھی اپنے علوم کو دوبارہ سے حاصل کیا ہے، اُس کا جو ذریعہ بنے، اُس کا جو آلہ بنے، وہ مسلمان بنے۔

تو بہر حال میں کہہ رہا تھا کہ بخاری و مسلم کی ایک بہت مشہور حدیث ہے حدیثِ جبرائیل، جو اُس میں جب نبیِ اکرم ﷺ سے پوچھا گیا: «فَأَخْبِرْنِيْ عَنِ السَّاعَةِ» یعنی خاتمے کی بابت ارشاد فرمائیے، فرمایا کہ: «مَا الْمَسْئُولُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ» یعنی بتانے والا، پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا اس بارے میں۔ پھر اگلا سوال کیا گیا کہ: « فَأَخْبِرْنِيْ عَنْ أَمَارَاتِهَا» کہ اس کی نشانیاں بتادیں، تو فرمایا کہ: «أَنْ تَلِدَ الأَمَةُ رَبَّتَهَا» کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جنے گی، اِس روایت کی کئی توجیہات ہیں لیکن ایک جدید توجیہ کچھ لوگوں نے کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اِس وقت ہمارا status کیا ہے؟ اِس وقت سے مراد تقریبًا دو سو برس سے جو ہمارا status ہے یا جو اِس وقت ہماری حیثیت ہے، لونڈی کی ہے، ہماری حیثیت غلام کی ہے، ہم subservient ہیں اور جو مالکہ ہے، وہ مغربی تہذیب ہے تو گویا لونڈی جو اِس وقت لونڈی ہے، اُس نے اپنی مالکہ کو جنا ہے یعنی گویا اسلامی تہذیب نے مغربی تہذیب کو جنم دیا یعنی جس کو جنم دیا تھا، وہ اُس کی مالکہ بن بیٹھی ہے، غالب آگئی ہے۔ تو بہر حال یہ جو میں نے عرض کیا ہے نا کہ پھر ہم colonize ہوگئے اور یہ کہا جاتا ہے کہ ۱۷۸۹ء سے لے کے ۱۹۱۴ء تک، اِس کو

کہا جاتا ہے the long nineteen century یعنی ۱۲۵ برس، اِس میں امتِ مسلمہ تقریبًا ساری کی ساری مغربی طاقتوں کے زیرِ نگیں آگئی، حجاز کا کچھ علاقہ، افغانستان، کچھ ترکی، کچھ ایران، بس یہ بچ گیا باقی ہم سب colonize ہو گئے۔ تو اُس کے بعد جو ہم پر اثرات ہوئے ہیں، وہ غیر معمولی ہیں اور یہ ٹھیک ہے کہ بھئی، آپ کو پتا ہے ہمارے یہاں دو انتہائیں ہیں: ایک انتہا جو مذہبی لوگوں کی طرف سے زیادہ تر ہوتی ہے، وہ ایک سازشی theory کا تصور ہے، ایک syndrome میں رہتے ہیں وہ کہ جی فلاں نے سازش کر لی، فلاں نے کر لی اور ہم تو گویا بہت اچھے بچے تھے، ہم میں کوئی مسئلہ نہیں تھا اور سات سمندر پار سے آکر ڈاکوؤں نے ہمیں لوٹا کھسوٹا اور ہمارے ساتھ یہ کیا، اِس کے برعکس جو ہمارے ہاں Islamic modernist کہلاتے ہیں، وہ بالکل opposite side پر کھڑے ہوتے ہیں، وہ سارا ملبا آپ کے بادشاہوں پر اور پھر آپ کی جو مذہبی class ہے، اُس پہ ڈال دیتے ہیں کہ جناب اِنھوں نے ہمیں پیچھے رکھا، اِنھوں نے ہمیں برباد کیا، اِنھوں نے ہمیں آگے نہیں بڑھنے دیا تو اصل میں بات یہ ہے کہ صحیح بات اِن دونوں کے درمیان کی ہے، منیر نیازی ایک بڑے اچھے شاعر ہیں، اردو کے بھی اور پنجابی کے بھی تو اُن کا ایک قطعہ بہت مشہور ہے، وہ کچھ اِس طرح کا ہے کہ:

کچھ اُنج وی راہاں اوکھیاں سن
کچھ گل وچ غم دا طوق وی سی
کچھ شہر دے لوگ وی ظالم سن
کچھ سانوں مرن دا شوق وی سی

اُن کا یہ دوسرا شعر ہے نا، کچھ شہر دے لوگ وی ظالم سن لیکن کچھ سانوں مرن دا شوق وی سی، ایک Algerian Thinker ہیں Malek Bennabi، الظاهرة القرآنية اُن کی کتاب بہت مشہور ہے، The Quranic Phenomenon اور بھی کئی کتابیں ہیں، اُن کا ایک بہت اچھا concept ہے colonizability کا، کہ ہم colonizable تھے، اِس وجہ سے ہم colonize ہوئے تو یا، جیسے ایک سادہ سا physiological concept ہے نا کہ انسان کا جسم جب کمزور ہو جاتا ہے، قوتِ مدافعت اُس میں کم ہو جاتی ہے تو پھر ہر طرح کا bacteria اور virus اُس پہ

حملہ کرتا ہے، ظاہری بات ہے کیونکہ، ہمارے اندر colonizability کی conditions پیدا ہو گئی تھیں، ہم colonize ہو گئے تو بہر حال اُس کے بعد جو تبدیلیاں ہمارے ساتھ ہوئی ہیں، وہ غیر معمولی ہیں اور جو ہمارے طاقت کے ادارے تھے ہماری حکومت، سلطنت کے، وہ توڑ دیے گئے، قضا کے ادارے ختم کر دیے گئے، جو ہمارے تعلیم کے ادارے تھے، مدرسہ تھا، جامعہ تھی، اُس کو dismantle کر دیا گیا اور جو ہمارے اخلاقی تربیت کے سرچشمے تھے، خانقاہیں تھیں، اُن کو بھی ختم کر دیا گیا تو گویا ہمارے ساتھ ایک بہت بڑی واردات ہوئی ہے لیکن آپ دیکھیں نا کہ المیہ یہ ہے کہ یہ باتیں ہمارے بیانیے میں شامل نہیں ہیں یعنی ہمارے ساتھ یہ سب کیوں ہو گیا؟ آپ مطالعۂ پاکستان کو ہی دیکھ لیں تو مطالعۂ پاکستان میں جو binary ہمارے سامنے لائی جاتی ہے، وہ ہندو مسلم کی binary ہے، سارا اسلامی، پاکستانی علم جو ہے، ساری Pakistan studies اِس پہ کھڑی ہوئی ہے، ہندو مسلمان، یہ دو الگ الگ قومیں تھیں، دو قومی نظریہ تھا، یہ تھا، وہ تھا، اُس میں جو غاصب اور جو استحصال کرنے والی قوت تھی یعنی استعماری انگریز، اُس کا مذکور ہی نہیں ہے یعنی مجھے ایسے لگتا ہے کہ ہمیں کوئی جیسے amnesia ہو گیا ہے ایک، collective amnesia ہمیں ہو گیا ہے۔ ہم یہ بھول گئے ہیں کہ بھئی انگریز نے کیا کیا تھا؟ اور اِس وقت تو آپ کو پتا ہے کہ پچھلے ۳۰، ۳۵، ۴۰ سال سے ایک پورا discipline مغرب میں develop ہو رہا ہے post-colonial studies کا یا decolonization کا تو اُس میں ہمارے پڑوس میں بہت کام ہوا ہے یعنی جو بھارت کے Ashis Nandy ہیں اور جناب Vishna ہیں پھر یہ جو politician ہے، جس کی کتابیں بہت مشہور ہیں، Shashi Tharoor یہ سب لوگ کام کر رہے ہیں، Inglorious Empire اور Era of Darkness وغیرہ وغیرہ پر، تو مطلب اُن کو اِس کا شعور ہے لیکن آپ دیکھیں ہمارے ہاں، ہمارے بیانیے میں اِس کا کوئی ذکر نہیں ہے اور اِسی لیے آپ دیکھتے ہیں آج کل کے دانشور، وہ ہر وقت یہ رونا پیٹنا ڈالتے رہتے ہیں کہ بھئی اگر ہمارے پاس کوئی ادارے بنے ہیں، ہم تو ایک میل بھی railway کو نہیں بڑھا سکے، اُنھوں نے یہ بنا دیا، drainage بھی بنا دیا، فلاں بنا دیا، ڈھما بنا دیا، وہ تو یہ کہتے ہیں کہ اگر انگریز یہاں نہ آتا، آپ تو ابھی تک medieval age میں ہی جی رہے ہوتے تو ہمیں تو انگریز کو سلام کرنا چاہیے، آپ دیکھیں نا Karl Marx نے تعریف کی ہے اور ویسے تو ظاہری بات ہے کہ وہ ایک لحاظ سے وہ

anti-imperialist تھا اور ایک خاص طرح کا جو liberal order ہے، اُس کے خلاف تھا لیکن اُس نے اِس کی تائید کی، اُس نے کہا کہ اچھی بات ہے یعنی یہ لوگ جو ہیں، وہ اِتنے پسماندہ تھے کہ بھئی اِن کو جو ہے، وہ اگر اِن پہ کوئی عرب آتے یا افغانی آتے تو وہ بھی اِن کے لیے مفید نہیں تھے۔ تو انگریزوں کا آنا اِن کے لیے blessing بن گیا کہ چلو کچھ تھوڑا سا grow کر گئے یہ، تھوڑا develop ہو گئے اور چونکہ اُس کا تصور بھی یہی ہے نا کہ بھئی مطلب جو انقلاب آئے گا، وہ phases میں آئے گا نا، agrarian age ہے، اُس کے بعد industrial age آئے گا پھر اُس کے بعد وہ انقلاب آئے گا، اِسی لیے آپ دیکھتے ہیں کہ اُس کے تصورات جو ہیں، وہ صحیح طرح کام نہیں کر سکے یعنی انقلاب اُس کا خیال تھا کہ جو سب سے زیادہ advanced ہیں industrially، industrial، جہاں پہ industries وغیرہ زیادہ ہیں، وہاں انقلاب آئے گا، مثال کے طور پہ England میں آئے گا تو وہاں تو نہیں آیا تو وہاں آیا ہے جہاں پر Agrarian society تھی یعنی China میں آیا ہے، یا Russia میں آیا ہے تو وہاں تو ابھی اُس طریقے سے industrial age آیا ہی نہیں تھا۔ اِسی لیے اُن کو باقاعدہ party بنا کر اور زور زبردستی لانا پڑا ورنہ Marx کی theory میں تو اُس کو اپنی ترتیب سے آنا تھا اور کیونکہ وہ ایک Historical materialism کا قائل تھا۔

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہم سب کو گویا اِس کی awareness ہونی چاہیے، اپنے طلبہ کے اندر بھی، یہ جو خاص طور پہ colonialism کا معاملہ ہے اور پھر اِس کے خلاف جو کچھ بھی باتیں ہوئی ہیں، ہمیں اُس کو سامنے رکھنا چاہیے، اِس میں ہمارے ہاں اکبر الہ آبادی جو ہیں اُن کو پڑھنا چاہیے اور اپنے طلبہ کو بھی متوجہ کرنا چاہیے، اقبال اور اکبر، اِن کا اِس پہ بہت کام ہے، ظاہر بات ہے اِن میں بہت فرق ہے یعنی اقبال بہت بڑے شاعر ہیں، اکبر اتنے بڑے شاعر نہیں ہیں فنی اعتبار سے، بہت سے اشعار تو اُن کے لگتا ہے کہ وزن میں بھی نہیں ہیں باقاعدہ اور اِن دونوں میں فرق یہ ہے کہ اقبال نے بات کی ہے گہری فلسفیانہ سطح پر کہ اُس کی metaphysical یا ontological یا epistemological جو چیزیں تھیں، اُن کو دیکھا ہے۔ لیکن اکبر الہ آبادی نے اُس تہذیب کے جو اوضاع ہوتے ہیں نا یعنی اُس کی manifestations ہوتی ہیں، اُس پر بات کی ہے کہ ٹرین نے کیا اثر ڈالا ہے؟ type نے کیا اثر ڈالا ہے؟، type سے کیا تبدیلی آئی ہے؟ جو ہاتھ والا نل ہے

اور جو جدید pipe ہے جس سے پانی آتا ہے، اِسی طریقے جدید science کے کیا نتائج ہیں؟ تو یہ دونوں لوگ گویا ہمارے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور اکبر الہ آبادی کو آپ دیکھیں نا کہ دو، دو مصرعوں میں اُنھوں نے، پورا colonial project بیان کر دیتے ہیں اور کتنی گہرائی میں جا کے مغرب نے ہمیں بدلا ہے:

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اُس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

تو گویا طبیعت میں جو metamorphosis ہوتا ہے اور بالکل بھیتر بدل جاتا ہے آدمی کا، دروں بدل جاتا ہے، یہ غیر معمولی صلاحیت مغرب میں ہے اور پھر آپ دیکھیں نا کہ جو colonialism کے دو projects تھے، ایک colonization of body کہہ لیں، of politics کہہ لیں، of territory کہہ لیں اور ایک colonization of heart and mind ہے تو یہ دو مرحلے ہیں، آپ دیکھیں نا اُن کا ایک شعر ہے، اُس میں دو مصرعوں میں اُنھوں نے بیان کر دیا ہے کہ:

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے
اب بسولا ہٹا تو رندا ہے

تو پہلا جو project تھا، وہ توپ کے ذریعے آیا، طاقت کے ذریعے آیا اور اُس کے بعد پروفیسر آ گئے، اُسی میں ظاہری بات ہے کہ orientalism بھی ہے اور اُسی میں ظاہری بات ہے missionaries بھی ہیں، مطلب بغیر imperialism، یہ Edward Said کے بعد تو اب یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے نا کہ یہ orientalism کا پورا project تھا، وہ ایک imperial project تھا اور وہ جیسے Macaulay نے کہا تھا نا کہ ہمارے محکوم بہت زیادہ تھے، کروڑوں میں تھے اُس وقت بھی، وہ ہزاروں میں تھے تو ہمیں اگر اِن کے اوپر حکومت کو برقرار رکھنا ہے تو ہمیں پھر ایک buffer نسل پیدا کرنی ہے جو ہمارے اور اِن کے درمیان جیسے interpreter کا کام کرے، جیسے افغانستان میں ہوا یعنی وہی لوگ تھے نا لٹک لٹک کے جا رہے تھے جہازوں سے یا کتنے لوگ تھے کہ وہ درمیان میں ایک agent طبقہ پیدا کرتا ہے استعمار، اور اُس کے ذریعے پھر حکومت کرتا ہے۔ تو اُس نے جو یہ بات کہی تھی نا کہ بھئی ہم ایسے لوگ پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ جو اپنے خون میں اور

اپنے چہرے کی رنگت میں تو ہندوستانی ہوں لیکن اپنے تصورات میں، خیالات میں اور خاص طور پہ کہا تھا اپنے taste میں، اپنے ذوق میں وہ مغربی ہوں، تو ایک نسل اُنھوں نے بنائی، پھر اُس کے لیے پروفیسر آئے، بسولا ہٹا تو رندا ہے۔ بسولا ایک کلہاڑا سا ہوتا ہے، وہ گویا مار دیتا ہے، ختم کر دیتا ہے۔ اور رندا چھیلتا ہے، نِک سُک سے درست کر دیتا ہے، اقبال کا بھی ایک شعر ہے ناظریفانہ شاعری میں کہ:

میاں نجار بھی چھیلے گئے ہیں
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

تو، وہ بھی چھیلے گئے ہیں۔ well wounded man اُن کو چاہیے تھا، وہ اُنھوں نے بنا دیا ہے استعمار کے لیے اور پھر اُس میں ایک سب سے بڑا اُن کا جو ذریعہ بنا ہے، وہ تعلیمی ادارے ہیں اور ہم سب طالبِ علم بھی ہیں، استاد بھی ہیں تو اِس لحاظ سے ہمیں ظاہری بات ہے، اِس بات کا شعور یقیناً ہو گا کہ تعلیم کے اندر کتنی غیر معمولی صلاحیت ہے اور پھر یہ بات کہ universal education یا general education یا compulsory education بجائے خود ایک imperial project ہے یعنی یہ بات کہ تعلیم سب کو دی جائے گی اور جبراً دی جائے گی، ابھی بھی دیکھیے نا ہمارے ہاں جرمانے ہوتے ہیں باقاعدہ، جس کا بچہ نہیں جائے گا، اُس پر FIR کٹ جائے گی اور سب کو اسکول میں لے کر آنا ہے تو کیوں لے کر آنا ہے؟ system کے لیے اُن کو تیار کرنا ہے آپ کو یعنی اگر آپ system سے باہر ہیں تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کوئی مشکوک آدمی ہیں، اس سسٹم کو چلانے کے لیے انھیں سستے مزدور اور مستری چاہییں، technicians چاہییں۔ تو آپ کے اسکولوں سے لے کے اعلیٰ ترین تعلیمی اداروں تک، پورا جو order ہے، اُس کو چلانے کے لیے کچھ جانور چاہییں جو کھینچ سکیں اِس کی گاڑی کو، ایسے لوگ وہ تیار کرتے ہیں اور ظاہری بات ہے کہ اِس میں غیر معمولی صلاحیت ہے، اقبال نے کہا تھا نا:

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اِسے پھیر

تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

یعنی سونے کے ہمالہ کو مٹی کے ڈھیر میں میں بدل دیتا ہے یہ نظامِ تعلیم اور کتنی غیر معمولی صلاحیت ہے، اکبر ہی نے کہا تھا کہ:

شیخِ مرحوم کی یہ بات یاد آتی ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

توہم سب دیکھتے ہیں کہ بھئی ہمارے دل اور ہماری اولادوں کے دل وہ بدل رہے ہیں اور بدل چکے ہیں اِس جدید تعلیم سے۔ ایک اور بات یہ کہ ہمارے ہاں جو مذہبی لوگ ہیں یا اساتذہ ہیں جو religious orientation رکھتے ہیں، اُن کو یہ احساس ہوتا ہے کہ الحاد بھی بہت بڑھ رہا ہے، بے دینی بڑھ رہی ہے تو الحاد سے زیادہ جو چیز بڑھ رہی ہے، وہ لاتعلقی ہے یعنی انکارِ خدا یا انکارِ مذہب تو چند لوگ کرتے ہیں اور as a fashion کرتے ہیں، زیادہ چیز یہ ہے کہ in difference ہے یا irrelevance ہے then what؟ یعنی خدا ہو تو بھی ٹھیک ہے، نہ ہو تب بھی ٹھیک ہے یعنی صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارا جو بھی بچہ سوشل سائنسز میں آنرز کرتا ہے، کسی بھی فیلڈ میں تو اب تو مسئلہ یہ ہے کہ سوشل سائنسز ہیں یا شریعت ہے کیونکہ دیکھیں انسان اور اُس کے سارے متعلقات، اُس کا باطن ہے، وہ نفسیات نے حل کر دیا، وہ لوگوں کے ساتھ میل جول ہے، وہ sociology نے کر دیا، اُس کی سیاست political science نے کر دی، ممالک کے درمیان inter relations آگئے، اُس کا معاشی مسئلہ، وہ economics نے حل کر دیا تو اب ضرورت کہاں ہے؟ یعنی خدا کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ اب مغرب میں بھی اور ہمارے یہاں بھی لوگ کہتے ہیں کہ عام آدمی خاص طور پہ جو public sphere کے دائرے ہیں، اُس میں وہ زندگی ایسے گزارتا ہے کہ as if God does not exist (گویا کہ خدا کا وجود ہے ہی نہیں) بس آپ کو کاروبار میں، market میں، آپ کو پارلیمینٹ میں، کچہری میں اور جناب ہائی کورٹ میں اور باقی سارے معاملات میں جیسے خدا کی ضرورت نہیں، یعنی ہماری universities میں بھی ہوتا ہے، بعض اوقات نوجوان آپس میں بھڑ رہے ہیں، کوئی atheist ہے، کوئی theist ہے، وہ آپس میں گفتگو کر رہے ہیں، ایک دنگل سا ہو رہا ہے، ملاکھڑا ہو رہا ہے لیکن

حیرت کی بات یہ ہے کہ life style دونوں کا ایک ہی ہے، ambitions بھی دونوں کے ایک ہی ہیں، لباس بھی دونوں کا ایک ہی ہے، slangs بھی دونوں کے ایک ہی ہیں، body language بھی دونوں کی ایک ہے تو اِس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ کہ آپ خدا کو مانتے ہیں یا خدا کو نہیں مانتے، زندگی تو ساری ایک ہی ڈگر پہ گزر رہی ہے نا تو یہ جو، جس کو ہم secularization کہتے ہیں، یہ شاید اُس سے زیادہ بڑا خطرہ ہے کہ مذہب جو ہے، وہ غیر متعلق ہوتا چلا جائے اور زیادہ سے زیادہ آپ کی ایک personal party یا ایک human subjectivity کا حصہ بن جائے اور انسانوں کے جو اجتماعی جو معاملات ہیں، اُس میں سے نکل جائے۔

جاری ہے

*****

مولانا حماد احمد ترک

نائب مدیر، ماہنامہ مفاہیم، کراچی

جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے (۱)

علامہ اقبال نے ویسے تو سلاطین کی پرستاری کو "فتنۂ ملتِ بیضا" قرار دیا لیکن ہمیں یقین ہے کہ اِن کی مراد اُن سلاطین سے ہے جو ظلم و جور کا پیکر رہے اور سلطنت کو ذاتی جاگیر کی طرح استعمال کرتے رہے۔ ذاتی مفاد پر ملک و ملت قربان کرکے ہماری تاریخ میں سیاہی کا سبب بنے۔ ایسے حکمرانوں نے ہمیشہ غیروں سے ساز باز کی اور اسلام دشمن قوتوں کے بل بوتے پر اپنا اقتدار مسلط کیا۔ لیکن انصاف پسند سلطان جسے حدیث شریف میں ظل اللہ کہا گیا، واقعتاً اس جہانِ بے سکوں میں اپنی قوم کے لیے شجرِ سایہ دار ہوتا ہے۔ ہماری تاریخ ایسے ہی نیک اور خدا خوف سلاطین سے پُر ہے۔ ان کا ذکر ہمارے دل سے احساسِ کمتری کو ختم کرتا ہے اور خود داری و جرات پیدا کرتا ہے۔ کچھ کر گزرنے کا عزم بیدار ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی خیال کے پیشِ نظر ارادہ ہوا کہ عثمانی اور مغلیہ سلاطین کے مختصر حالات قلم بند کیے جائیں اور انھیں قسط وار شایع کیا جائے۔ اولاً سلطنتِ عثمانیہ کے سلاطین کے احوال بالترتیب بیان کیے جائیں گے:

عثمانی سلاطین

۶۲۵ سال تک آب و تاب کے ساتھ دنیا پر حکومت کرنے والی سلطنتِ عثمانیہ دنیا کی طویل ترین سلطنتوں میں سے ایک ہے جس نے اپنی رعایا کے لیے عدل و انصاف اور بحالی و خوشحالی کو ہمیشہ مقدم رکھا اور بلا تفریقِ مذہب و قوم ہر ایک کے لیے امن و سلامتی کا پرچم لہرایا۔ اسلامی تاریخ کی چھے صدیاں عثمانیوں کے چراغ سے روشن رہیں اور انھوں نے طویل عرصہ عالمِ اسلام کو غلامی کے داغ سے بچائے رکھا۔ اگرچہ 'کعبے کو یہ پاسبان صنم خانے سے ملے' لیکن انھوں نے پاسبانی کا

حق ادا کر دیا۔ ہر ہر سلطان جرات و بہادری میں اپنی مثال آپ ہے۔ سلطنتِ عثمانیہ کے ۳۶ سلاطین کی ترتیب کچھ یوں ہے:

۱) عثمان غازی (۱۲۵۸-۱۳۲۶ء)

اپنے والد ارطغرل غازی کی وفات پر ۱۲۸۱ء میں کائی قبیلے سے سردار منتخب ہوئے۔ اناطولیہ کے عالم باعمل حضرت شیخ اَدبالی آفندی سے کسبِ علم کیا اور ان سے فیض پایا۔ عثمان غازی بہت پابندی کے ساتھ شیخ کے دروس میں شرکت کیا کرتے اور اہتمام کرتے کہ کوئی سبق بھی فوت نہ ہو۔ ۱۲۷۷ء میں عثمان غازی نے خواب میں دیکھا کہ شیخ کے سینے سے ایک چاند نکلا اور ان کے سینے میں داخل ہو گیا۔ پھر ان کے بطن سے ایک درخت اگا اور اس نے سارے عالم کو اپنے سائے میں لے لیا۔ شیخ نے تعبیر دی کہ تمھاری اولاد کو سلطنت عطا ہو گی اور دنیا تمھارے جھنڈے تلے اکھٹی ہو گی۔ عثمان غازی نے مٹھی بھر مجاہدین کو ساتھ ملایا اور جہاد جاری رکھا۔ سردار بننے کے چار سال بعد ہی ۱۲۸۵ء میں ایناکول کے حاکم سے جنگ مول لی۔ ۱۲۸۶ء میں محض تین سو سپاہیوں کے ساتھ کولاجاحصار فتح کیا، ایناکول اور قاراجا کے حاکموں نے عثمان کے خلاف متحدہ محاذ بنایا لیکن شکست سے دوچار ہوئے۔ ۱۲۸۸ء میں قاراجا بھی فتح ہو گیا اور پہلی مرتبہ ایک کلیسا کو مسجد میں تبدیل کیا گیا اور عثمان غازی کے نام کا خطبہ پڑھایا گیا۔ ۱۲۸۹ء میں سلجوقی فرماں روا نے عثمان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو تسلیم کیا، انھیں تحفے تحائف بھیجے اور انھیں ان کی اراضی پر امیر متعیّن کر دیا۔ یہ سلجوقی سلطنت کی جانب سے مدد و نصرت کا پیغام تھا۔ ۱۲۹۸ء میں عثمانی مجاہدین نے بیل جیک اور یار حصار جیسے اہم قلعے فتح کیے۔ مسلسل فتوحات جاری رہیں حتیٰ کہ ۱۲۹۹ء میں عثمان غازی نے ایناکول فتح کر کے سلطنت کے قیام کا اعلان کیا اور ان کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ پھر تو فتوحات کا گویا تانتا بندھ گیا اور جب تک عثمان غازی صحت مند رہے پے در پے فتوحات کرتے رہے۔ ۴۰۰ خیموں سے شروع ہونے والی سلطنت کو عثمان غازی نے اپنے بیٹے اورخان کے حوالے کیا تو اس کا رقبہ ۱۶ ہزار مربع کلو میٹر تھا۔

۲) اورخان غازی (۱۲۸۱-۱۳۶۰ء)

محض ۲۰ سال کی عمر میں ایک صوبے کے گورنر متعیّن ہوئے۔ تمام عمر جہاد میں گزار دی۔ والد کی وفات پر ۱۳۲۶ء میں

سلطان بنے۔ اورخان غازی کا ہدف بورصا تھا جس کے لیے انھوں بہت جدوجہد کی۔ ۱۳۲۱ء میں مودانیا فتح کرکے بورصا کی بحری گزر گاہ کو مسدود کردیا۔ بورصا کے اردگرد کے تمام علاقے فتح کرکے اہلِ بورصا پر دانہ پانی بند کردیا، اس کے باوجود بھی بورصا کی سخت جان فوج سالوں قلعہ بند رہی۔ جب محاصرہ طویل ہوگیا اور اہلِ شہر محاصرے سے تنگ آگئے تو انھوں نے ہتھیار ڈالنے پر آمادگی ظاہر کی۔ بالآخر دس سال طویل محاصرے سے مضمحل بازنطینی افواج نے عام معافی کی شرط پر قلعے کے دروازے کھول دیے اور عثمانی فوج ۶ اپریل ۱۳۲۶ء کو بغیر کسی مقابلے کے شہر میں داخل ہوگئی۔ وہ بورصا جسے سر کرنے کی کوششیں ۱۳۱۵ء سے جاری تھیں اورخان نے ۱۳۲۶ء میں اسے فتح کرلیا۔ یہ فتح اورخان کے نمایاں کارناموں میں شمار کی جاتی ہے۔ ۱۳۳۱ء سے ۱۳۳۶ء کے درمیان تاراکلی، مودور نو اور اولوبات سمیت متعدّد شہر فتح کیے۔ ۱۳۳۷ء میں موجودہ ترکی کا مشہور شہر ازمیت فتح ہوا تو اہم بحری راستے سلطنت کے اختیار میں آگئے۔ ۱۳۵۲ء میں اُسکودار فتح کیا اور صرف دو سال بعد یعنی ۱۳۵۴ء میں انقرہ (جو موجودہ ترکی کا دارالحکومت ہے) سلطنتِ عثمانیہ کے زیرِ نگیں آگیا۔ ۱۳۵۶ء میں مالکارا، کاشان اور چورلو فتح کرکے اناطولیہ میں مسلمانوں کی وسیع پیمانے پر آبادکاری کا انتظام کیا جس سے بازنطینی حکام شدید مشتعل ہوئے۔ ''کانتاکوزنیس'' بازنطینی حاکموں کا لقب ہوا کرتا تھا، چنانچہ یوخانیس کانتاکوزنیس سادس ایک موقع اپنی سلطنت کے حصول کے لیے اورخان غازی سے مدد کا طالب ہوا۔ اورخان نے قیصر کے خلاف یوخانیس کی مدد کے لیے اپنے بیٹے سلیمان پاشا کی قیادت میں دس ہزار عثمانی سپاہی روانہ کیے، مقابلے میں بازنطینی لشکر کو فتح ہوئی۔ خیر سگالی کے طور پر یوخانیس نے اپنی بیٹی تھیوڈورا کو اورخان کے نکاح میں دے دیا۔ اس جنگ سے واپسی پر عثمانی سپاہیوں کا ایک دستہ جزیرہ نما کیلی پولس کے ایک اہم قلعے جیمبا میں مقیم ہوگیا اور یہاں سے بہت سی عسکری سرگرمیاں انجام دیتا رہا۔ طویل عرصے بعد یوخانیس کو خیال ہوا کہ اپنے داماد اورخان سے جیمبا قلعہ خرید لینا چاہیے کیونکہ یہ قلعہ خطے میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یوخانیس نے اورخان کو دس ہزار سونے کے سکوں کے عوض قلعے کا سودا کرنے کی پیشکش کی، جسے اورخان نے منظور نہیں کیا۔ ۱۳۵۹ء میں دورانِ جہاد سلیمان پاشا کی اچانک موت نے اورخان کو شدید صدمے سے دوچار کردیا، بیٹے کے غم میں ہلکان ہوکر کچھ عرصہ بیمار رہا اور انتقال کرگیا۔ اورخان غازی نے عسکری نظام میں بے شمار اصلاحات کیں۔ جس شہر کو فتح کیا وہاں علمی و معاشی بحالی کے لیے اقدامات کیے۔ پہلا عثمانی مدرسہ اورخان غازی کے ہاتھوں قائم ہوا۔ کلیسا

مساجد میں تبدیل ہوئے اور علم وعمل میں ترقی کی راہیں ہموار ہوئیں۔

۳)مراد خان اول(۱۳۲۶-۱۳۸۹ء)

۱۳۶۰ء میں اپنے والد اور خان کی وفات کے بعد تخت نشین ہوئے۔جنگی صلاحیتوں میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ تخت نشینی کے تیسرے سال ہی عیسائیوں سے ادرنہ جیسا اہم شہر چھین لیا اور اپنی قلم رو میں شامل کیا۔ ادرنہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ فتحِ قسطنطنیہ کا ایک اہم راستہ اور ذریعہ تھا اور فتحِ استنبول تک سلطنتِ عثمانیہ کا دار الحکومت بنا رہا۔ سلطان ہی کی جدوجہد سے ادرنہ علم وفن کا مرکز بن گیا اور بازنطینی خطوں سے آنے والے لوگوں کے لیے جاے پناہ ثابت ہوا۔ سلطان نے فتحِ ادرنہ کے بعد بہت سے چھوٹے بڑے شہر فتح کیے۔ سلطان مراد خان نے یہ وتیرہ بنالیا کہ جو شہر بھی فتح کرتے، وہاں مسلمانوں کو کثیر تعداد میں لاکر آباد کر دیتے۔ اس طرح مفتوحہ علاقوں سے بازنطینیوں کا اثر و رسوخ ختم ہوتا چلا گیا۔ سلطان کے اس فعل پر عیسائی بہت سیخ پا ہوئے اور ہر سو انتقام کی خواہش سر اٹھانے لگی۔ پاپاے اعظم خامس کی ترغیب پر یورپ کے بہت سے ممالک نے طبلِ جنگ بجایا اور صلیبی افواج متحد ہو کر سلطان سے مقابلے کا عزم لیے اناطولیہ آن پہنچیں۔ ادرنہ کو نشانے پر رکھا اور پیش قدمی شروع کی۔ شیر من نامی شہر کے قریب دونوں لشکروں کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ عثمانی افواج نے ان کا بے جگری سے مقابلہ کیا۔ متحدہ صلیبی فوج نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن اللہ کی مدد اور مراد خان کی جنگی حکمتِ عملی کے آگے ان کی پیش نہ گئی۔ مراد خان کے لشکر نے تین اطراف سے حملہ کیا اور انھیں پیس کر رکھ دیا۔ اس کے بعد سلطان نے بلقان کو ہدف بنایا اور سربیا سے ملحق علاقوں کو زیرِ نگیں کیا۔ سلطان کے عہد میں مقدونیا، سربیا، بوسنیا، البانیا، دالماتیا (دالماشا) تک عثمانی افواج کی یلغار رہی۔ ۱۳۷۶ء میں بلغاریہ عثمانی سلطنت کے زیرِ نگیں آگیا۔ اگست ۱۳۸۹ء میں صلیبیوں کا ایک لشکرِ جرار عثمانی لشکر کے مدِ مقابل آیا اور شکست وریخت سے دوچار ہوا۔ اسے معرکۂ کوسووہ کہا جاتا ہے۔ اسی جنگ میں سلطان کے دل میں ایک خنجر لگا جس سے وہ زخمی ہوگئے۔ سلطان نے تمام عمر جہاد میں گزار دی، یہ جنگ ان کی زندگی کی آخری جنگ تھی۔ خنجر کا وار کاری ثابت ہوا اور سلطان جانبر نہ ہو سکے، سلطان کو شہادت کی سعادت نصیب ہوئی۔ مشہور ہے کہ انھیں کبھی بھی میدانِ جنگ میں شکست نہیں ہوئی۔

۴)یلدرم بایزید خان (۱۳۶۰ء-۱۴۰۴ء)

سلطان بایزید اول اپنے والد مراد خان کے بعد سلطنتِ عثمانیہ کے حاکم ہوئے۔ دینی، عصری اور عسکری ہر نوع کی تعلیم دل جمعی سے حاصل کی۔ ۲۱ سال کی عمر میں پہلی ذمے داری 'کوتاہیا' کے والی کی حیثیت سے سنبھالی اور ۲۹ سال کی عمر میں والد کی شہادت کے بعد تخت نشین ہوئے۔ یلدرم کا معنی ہے ''بجلی''۔ میدانِ جنگ میں آپ کی سرعت اور برق رفتاری و مہارت کے سبب اس لقب کو حاصل کیا۔ سلطان بایزید نے سلطنت کی توسیع کو ہدف بنایا اور بہت سے معرکے سر کیے۔ سلانیک اور ینی شہر کو فتح کر کے حدودِ سلطنت کو ہنگری سے ملا دیا۔ سلطان کی نظریں یورپ پر لگی ہوئی تھیں جس سے اہلِ یورپ خوفزدہ تھے۔ چنانچہ شاہِ ہنگری کی درخواست پر پاپائے اعظم کو حرکت میں آنا پڑا اور پوری عیسائی دنیا سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف محاذ بنا کر امڈ آئی، چودھویں صدی عیسوی کی ''نیٹو افواج'' میں بڑی بڑی قوتوں کا حصہ تھا۔ فرانس، برطانیہ، اسکاٹ لینڈ، جرمنی، پولینڈ، بوہیمیا، آسٹریا، ہنگری، اٹلی، سوئٹزر لینڈ، بیلجیم اور دیگر بہت سے یورپی ممالک لاؤ لشکر اور بھاری ہتھیاروں کے ساتھ سلطنتِ عثمانیہ پر حملہ آور ہوئے۔ ان کا مقصد اولاً یورپ اور بالآخر اناطولیہ کو عثمانیوں سے خالی کرانا تھا اور القدس کو حاصل کرنا تھا۔ یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا تھا جب سلطان فتحِ قسطنطنیہ کا خواب لیے استنبول کے گرد حصار قائم کر چکے تھے اور یہ حصار شدت پکڑتا جا رہا تھا۔ اس غیر متوقع عیسائی حملے نے سلطان کو محاصرہ اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ ۲۵ ستمبر ۱۳۹۶ء کی صبح عثمانی اور بازنطینی لشکر میدان میں اترے اور گھمسان کا رن پڑا۔ دوپہر سے پہلے پہلے عثمانی لشکر نے بازنطینیوں کو بدترین شکست دے کر ان کی قبائے دریدہ پر ذلت و رسوائی کا نہ مٹنے والا داغ لگا دیا۔ اس جنگ کو معرکۂ نکوپولِس کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی جنگیں لڑیں اور سلطنت کو طرابزون تک وسیع کر دیا۔ ایک بار پھر بایزید نے استنبول کا محاصرہ کر لیا لیکن ایک اور واقعے نے دوبارہ سلطان کو محاصرہ اٹھانے پر مجبور کیا۔ ہوا یہ کہ ماوراء النہر اور ایران پر قبضے کے بعد جب امیر تیمور خان نے بغداد پر قبضہ کیا تو وہاں سے فرار ہونے والے سرداروں کو سلطان بایزید نے پناہ دی۔ اور سلطان کے پاس سے بہت سے لوگ فرار ہو کر تیمور کے پاس چلے گئے۔ دونوں بادشاہوں کو جھوٹی سچی شکایتوں اور حکایتوں کے ذریعے ایک دوسرے کے خلاف بھڑکایا گیا۔ دونوں کو ہی اپنی قوت اور سلطنت کا زعم تھا۔ تیمور نے بایزید سے مطالبہ کیا

کہ مفرور سرداروں کو میرے حوالے کیا جائے لیکن بایزید نے اس کا حکم ٹھکرا دیا، جس پر امیر تیمور غضب ناک ہوا اور ایک لشکرِ جرار لے کر اناطولیہ میں داخل ہو گیا۔ چنانچہ چوتھی مرتبہ بایزید کو استنبول سے محاصرہ اٹھانا پڑا اور بورصا میں دفاعی نظام مستحکم کرنا پڑا۔ عثمانی لشکر کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی جبکہ تیمور تین لاکھ خونخوار سپاہیوں کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ جنگ شروع ہوئی تو ایسا شدید مقابلہ تھا کہ کسی کے بچنے کی امید نظر نہ آتی تھی لیکن عین معرکے میں بایزید کے بعض مشہور سردار تیمور کے لشکر میں شامل ہو گئے۔ بایزید کو ہزیمت اٹھانی پڑی اور اسے قیدی بنا لیا گیا۔ اگرچہ تیمور نے بایزید سے بہت اچھا سلوک کیا لیکن بایزید اسیری کی ذلت نہ سہہ سکا، سات ماہ قید میں رہا اور محض ۴۳ سال کی عمر میں جان؛ جان آفریں کے سپرد کر دی۔ سلطان بایزید اول کے دور میں بے شمار مساجد، مدارس، فلاحی ادارے مسافر خانے، بازار، ہسپتال، حمام، سڑکیں، پُل اور پانی کی سبیلیں قائم ہوئیں۔ ان کا سب سے نمایاں کارنامہ بورصا کی جامع مسجد "اولو جامی" ہے۔ آپ کے عہد میں بحری لشکر کی تشکیل و تنظیم ہوئی اور باقاعدہ بحری فوج کے لیے تعلیم کا اہتمام کیا گیا۔

ایک بات اس موقعے پر دلچسپی کا باعث ہوگی کہ جس سال یعنی ۱۳۶۰ء میں مراد خان اول تخت نشین ہوئے، اسی سال ان کے یہاں بایزید کی ولادت ہوئی، اگرچہ اولاد تو اور بھی تھی لیکن جس نے تخت کا وارث ہونا تھا، وہ بیٹا ۱۳۶۰ء میں پیدا ہوا۔ اسی مراد خان اول بھی اسی سال پیدا ہوئے جس سال ان کے والد اور خان غازی تخت نشین ہوئے۔ اسی طرح اور خان غازی بھی اسی سال پیدا ہوئے جس سال ان کے والد عثمان غازی قبیلے کے سردار منتخب ہوئے۔

جاری ہے

کتابیات:

السلاطين العثمانيون، راشد كوندوغدو، الناشر: دار الرموز للنشر، إسطنبول، ۲۰۱۸

آلبوم پادشاہانِ عثمانی، مترجم: میلاد سلمانی، ناشر: انتشاراتِ قَقْنُوس، استنبول، ۲۰۱۵

* * * * *

مولانا امام رضا
فاضل فقہ اکیڈمی

ہوم اسکولنگ

راقم نے حال ہی میں اپنی بچی کی ہوم اسکولنگ شروع کی ہے اور اس سلسلے میں جب لوگوں سے میل جول ہوا تو راقم کو لوگوں سے مختلف باتیں سننے کو ملیں جیسے کچھ حضرات نے فرمایا کہ آپ تو جاب کرتے ہیں تو پھر کیسے بچوں کی ہوم اسکولنگ کریں گے؟ اتنا ٹائم کہاں سے نکالیں گے؟ کچھ لوگوں نے ہمدردی کے ساتھ افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بہت بڑی ذمے داری ہے جو آپ نے لے لی۔ لوگوں کے ان تبصروں سے راقم کو بہت حیرانی ہوئی اور یہ بھی پتا چلا کہ ہوم اسکولنگ سے متعلق لوگوں کی بہت سی غلط فہمیاں ہیں اور ان کی معلومات بہت ناقص ہیں۔ چنانچہ مناسب معلوم ہوا کہ ان غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کے لیے ایک مضمون لکھا جائے جو لوگوں کے ذہنوں سے ان غلط فہمیوں کو دور کر سکے۔

پہلی بڑی غلط فہمی: گھر کو اسکول بنالینا

ہوم اسکولنگ سے متعلق ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہوم اسکولنگ سے مراد اسکول کو گھر پر لے کر آجانا ہے، یعنی جس طرح اسکول میں بچہ پانچ چھے گھنٹے مسلسل گزارتا ہے، بالکل اسی طرح گھر پر بھی پانچ چھے گھنٹے کی تعلیم ہوگی، جس میں بالکل اسکول کی طرز پر مختلف پیریڈز ہوں گے اور والدین بچوں کو پڑھائیں گے۔ یہی وہ غلط فہمی ہے جس کی وجہ سے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ بہت مشکل کام ہے اور اس کو جاب کے ساتھ کرنا ناممکن نہیں تو بہت زیادہ مشکل ضرور ہے۔ اس کا جواب ہوم اسکولنگ کے تصور کو سمجھنے میں ہے، جس کو ہم نیچے مضمون میں قدرے تفصیل سے بیان کریں گے۔

دوسری بڑی غلط فہمی: بچے کی اعلیٰ تعلیم اور جاب کا حصول نہیں ہو پائے گا

دوسری بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ اگر بچہ اسکول نہیں جائے گا تو اعلیٰ تعلیم اور جاب نہیں حاصل کر پائے گا۔ تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ ہوم اسکولنگ کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ بچہ تمام تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کرے اور آگے اعلیٰ تعلیم کے لیے کالج یا یونی ورسٹی نہیں جائے۔ بلکہ ہوم اسکولنگ سے بچہ گھر پر اس قابل ہو سکتا ہے کہ براہِ راست کالج یا یونی ورسٹی میں جا سکے۔ بہت سے لوگ پاکستان میں اپنے بچوں کی ہوم اسکولنگ کے بعد ان کو O، لیول اور A، لیول کرواتے ہیں اور اس طرح وہ آگے یونی ورسٹی اور کالج میں داخلہ لے کر ہر قسم کی پروفیشنل تعلیم حاصل کر سکتے ہیں اور اسی طرح جاب کر سکتے ہیں۔ ایمازون پر برینی بنچ کے نام سے ہارڈنگ فیملی کی ایک کتاب ہے جس میں ہارڈنگ فیملی کے دس میں سے چھے بچوں کا بارہ سال کی عمر میں کالج میں جانے کا ذکر ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ انھوں نے ان سب بچوں کی ہوم اسکولنگ کی تھی اور یہ بچے کوئی بہت زیادہ ذہین نہیں بلکہ اوسط درجے کے تھے۔ مگر بہت کم عمر میں انھوں نے اسکول سے بھی زیادہ لرننگ کر لی اور بغیر اسکول گئے اپنے ہم عمر اسکول کے بچوں سے بھی کم وقت میں کالج یونی ورسٹی میں چلے گئے۔

ہوم اسکولنگ اصل میں کیا ہے؟

آئیے اب ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ ہوم اسکولنگ اصل میں کیا ہے؟ امریکی ایجوکیشنلسٹ (Sherri Linsenbach) شیری 'ہوم اسکولنگ' کی تعریف اس طرح کرتی ہیں کہ ہوم اسکولنگ زندگی گزارنے کا طریقہ ہے۔ ہوم اسکولنگ میں بچے کو پڑھایا نہیں جاتا بلکہ اس کو سیکھنے میں سہولت فراہم کی جاتی ہے، اور ایک سیکھنے والا ماحول فراہم کیا جاتا ہے، جس میں بچہ خود بخود دلچسپی لیتا ہے اور خود ہی سیکھتا چلا جاتا ہے۔ اور اس خود سیکھنے کے عمل میں بچے کو جہاں کوئی مشکل ہوتی ہے تو وہاں بقدرِ ضرورت اس کی مدد کی جاتی ہے۔ ہوم اسکولنگ کوئی پیچیدہ عمل نہیں۔ اس کے لیے والدین کو کسی ڈگری یا ماہرانہ تعلیم کی ضرورت نہیں پڑتی، یہ بڑی فطری چیز ہے۔ البتہ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ہوم اسکولنگ میں بچہ والدین کے ساتھ یا گھر پر نسبتاً زیادہ وقت گزارتا ہے، اس لیے کچھ چیزیں جو والدین کے لیے اپنے بچوں کی اچھی پرورش کرنے کے لیے

ضروری ہوتی ہیں، ہوم اسکولنگ کے لیے مزید اہمیت کی حامل بن جاتی ہیں۔ جیسے بچوں سے تعلق قائم کرنا، ان کے ساتھ وقت گزارنا، ان کی عزت نفس کا خیال رکھنا، ان کے ساتھ صبر اور تحمل کا معاملہ کرنا، ان کی نفسیات اور ضروریات کو سمجھنا، ان کے رویوں میں تبدیلی پر نگاہ رکھنا اور اس کی وجوہات پر غور کرنا ہوم اسکولنگ میں ناگزیر ہو جاتی ہیں۔ اگر ان معاملات میں حکمت سے کام نہ لیا جائے تو بچے پر گھر میں اسکول سے زیادہ دباؤ آجائے گا۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ یہ چیزیں جو تمام والدین ہی کے لیے ضروری ہیں، چاہے وہ اپنے بچوں کو روایتی اسکولوں میں ہی بھیجتے ہوں، زندگی کی نفسانفسی میں ہماری ترجیحات میں شامل نہیں رہیں۔

بچہ خود کیسے سیکھ سکتا ہے؟

یقیناً یہ بات ہمیں بہت زیادہ حیران کن لگتی ہے کہ بچہ پڑھائے بغیر خود کیسے سیکھ سکتا ہے؟ جبکہ ہمارے بچے تو اسکول میں بھی پڑھ کر نہیں دیتے تو خود کیسے پڑھیں گے؟ ہماری اس سوچ کی بنیاد یہ ہے کہ ہم نے جب سے آنکھ کھولی ہے جب سے اسکول کو ہی دیکھا ہے اس لیے ہماری نفسیات میں یہ چیز بیٹھ گئی ہے کہ جب تک بچے کو کوئی چیز سکھائی نہ جائے وہ سیکھ نہیں سکتا۔ مگر یہ غلط فہمی معمولی غور و فکر سے دور ہو سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ بچہ تین چار سال کی عمر میں ہماری مادری زبان خود بخود بولنا کیسے سیکھ لیتا ہے؟ کیا ہم نے اس کو کسی اسکول یا کسی استاذ سے اپنی مادری زبان کا کورس کروایا تھا؟ جس کی وجہ سے وہ فر فر بولنا سیکھ لیتا ہے۔ ہم نے اس کو صرف ماحول دیا جس میں اس نے مادری زبان بولتے لوگوں کو سنا اور پھر فر فر بولنا شروع کر دیا۔ اللہ رب العزت نے بچے کو ایسے ہی تخلیق کیا ہے کہ اس میں سیکھنے کی صلاحیت رکھی ہے۔

بچے کا خود سیکھنے کا عمل کسی کے سکھانے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے

امریکی ایجوکیشنلسٹ جان ہالٹ نے اس موضوع پر بہت کام کیا ہے اور اس نے اپنے تیس چالیس سال کے تجربات سے ثابت کیا ہے کہ بچے کے اندر خود سے سیکھنے کی صلاحیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ کسی کے سکھانے سے زیادہ خود سے بہت جلدی سیکھتا ہے۔ مثلاً اسکول میں بچوں کو حروفِ تہجی پہلے پڑھائے جاتے ہیں اور اس کے بعد الفاظ بنانے کی طرف

لایا جاتا ہے اور پھر کہیں جا کر ریڈنگ کی طرف لایا جاتا ہے۔ اس طرح اسکول بچوں کو مطالعے کے قابل بنانے میں کافی وقت ضائع کر دیتا ہے۔ امریکی ایجو کیشنلٹ جان ہالٹ کہتا ہے کہ بچے بغیر حروفِ تہجی کے براہِ راست الفاظ سے مطالعہ کرنا سیکھ سکتے ہیں، اور یہ سیکھنے کا دورانیہ زیادہ سے زیادہ صرف تیس گھنٹے ہے۔ اس طرح اسکول میں بچوں کا ضائع ہونے والا ایک بڑا قیمتی وقت بچ جاتا ہے۔ جان ہالٹ اس سلسلے میں اپنی کتاب "لرننگ آل دا ٹائم" میں کوپن ہیگن کے قریب ایک اسکول کا ذکر کرتا ہے، جس میں دیگر اسکولوں کے برعکس کوئی روایتی یا رسمی تعلیم نہیں دی جاتی، وہاں تدریسی جماعتیں نہیں ہیں، ہدایات نہیں دی جاتیں اور نہ ہی ٹیسٹ لیے جاتے ہیں۔ وہاں بچے بالکل بڑوں کی طرح اپنی مرضی سے مطالعہ کر سکتے ہیں اور جو چاہیں، جب چاہیں، جس کے ساتھ چاہیں اور جتنا چاہیں مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اگر وہ ضرورت محسوس کریں تو کسی بھی وقت راسمس ہینسن (Rasmus Hansen) کے پاس جا سکتے ہیں، جو اس اسکول میں مطالعہ سکھانے کے استاذ ہیں۔ جان ہالٹ کہتے ہیں کہ میں نے راسمس سے پوچھا کہ بچوں کو خود سے مطالعہ کرنے کے قابل بنانے کے لیے کتنی مدت درکار ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ اپنے ریڈنگ سیشن کے سابقہ ریکارڈ کو سامنے رکھتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ وقت جو کسی بچے نے ان کے ساتھ مطالعہ کرنے میں گزارا، اس کا دورانیہ تیس گھنٹے ہے۔ یعنی صرف تیس گھنٹوں کے اندر بغیر حروفِ تہجی کے بچے پڑھنا سیکھ جاتے ہیں۔ اس سے جان ہالٹ ثابت کرتا ہے کہ کس طرح اسکول بچوں کا وقت ضائع کرتے ہیں کہ ان کو مطالعے کے قابل بنانے کے لیے سالوں کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔

اسکولوں کی تباہ کاریاں

اسکول کی تباہ کاریوں پر مغرب کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ اسکول ہمارے بچوں کا نہ صرف وقت ضائع کرتے ہیں بلکہ ہمارے بچوں کی صلاحیتوں کو بھی ختم کر دیتے ہیں۔ بقولِ اقبال:

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے، اسے پھیر

تاثیر میں اِکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹّی کا ہے اک ڈھیر!

اس سلسلے میں جان ہالٹ اور جان ٹیلر کافی نمایاں ہیں۔ ہم قارئین کو صرف جان ٹیلر گیٹو(John Taylor Gatto)کی درج ذیل دو کتب کا مشورہ دیں گے جن کا مطالعہ بہت مفید ہے:

وپپن آف ماس انسٹرکشن(Weapons of Mass Instruction)

ڈمبنگ اَس ڈاؤن(Dumbing us down)

ہوم اسکولنگ کے بچے اسکول کے بچوں سے آگے ہوتے ہیں

امریکی ادارے این ایچ ای آر آئی کی ریسرچ کے مطابق ہوم اسکولنگ کے بچے اسکول کے بچوں سے کافی آگے ہوتے ہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ ہوم اسکولنگ کے بچوں میں خود سیکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے جبکہ اسکول کے بچوں میں اسپون فیڈنگ کی عادت ہوتی ہے یعنی وہ خود مطالعہ کرنے اور سیکھنے کے بجائے اسکول پر انحصار کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم اوپر ایمازون پر بریئی بنچ کے نام سے ہارڈنگ فیملی کی ایک کتاب کا ذکر کر چکے ہیں، جس میں ہارڈنگ فیملی کے دس میں سے چھے بچوں کا بارہ سال کی عمر میں کالج میں جانے کا ذکر ہے۔ اس سے ہوم اسکولنگ کے بچوں کا اسکول کے بچوں سے آگے ہونا قرینِ قیاس ہے۔

ہوم اسکولنگ سے متعلق اعداد و شمار

آیئے اب ہم امریکہ میں ہوم اسکولنگ سے متعلق امریکی ادارے یو ایس ڈی ای اور این ایچ ای آر آئی کے ۲۰۲۲ء کے اعداد و شمار دیکھتے ہیں:

اس وقت امریکہ میں سوا تین ملین کے قریب بچے ہوم اسکولنگ کر رہے ہیں اور ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ہوم اسکولنگ کو امریکہ میں سب سے زیادہ تیزی سے اضافہ ہونے والی تعلیمی شکل قرار دیا گیا ہے۔ ہوم اسکول والے بچے اسکول میں پڑھنے والے بچوں سے آگے ہوتے ہیں۔ ہوم اسکولنگ نے سالانہ ۵۶ بلین ڈالر کی ٹیکس کی رقم کی بچت کی ہے۔

امریکی والدین کی ہوم اسکولنگ کرنے کی پہلی بڑی وجہ اسکولوں کا غیر تسلی بخش ماحول ہے جیسے: ڈرگز کا استعمال، سیفٹی اور نگیوٹیو peer پریشر وغیرہ۔ جبکہ دوسری بڑی وجہ اسکول کی غیر تسلی بخش تعلیمی انسٹرکشنز ہیں۔ یہ تو تھا امریکی اسکولوں کا حال، باقی پاکستان میں اسکولوں کا کیا حال ہے؟ ہم سب جانتے ہیں۔ لہٰذا اسکولوں میں بھاری فیسیں دے کر اپنے بچے کی صلاحیتوں کو ختم کرانے سے بہت بہتر ہے کہ ہم ہوم اسکولنگ کریں اور اسکول کے بھاری بھر کم اخراجات اپنے بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے خرچ کریں۔

پاکستان میں ہوم اسکولنگ

اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پاکستان میں بھی لوگ ہوم اسکولنگ کر رہے ہیں؟ اور اگر کر رہے ہیں تو کیا ان کے بھی وہی نتائج ہیں جو امریکہ کے ہوم اسکولنگ کے اعداد و شمار سے ہمیں پتا چلتے ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے پاس امریکہ کی طرح کوئی ایسا ادارہ نہیں، جو یہ اعداد و شمار جمع کرے۔ مگر کچھ ادارے جیسے سلمان آصف صاحب کا ادارہ ای آر ڈی سی ہے، اس کی نگرانی میں بہت سے لوگ اپنے بچوں کی ہوم اسکولنگ کر رہے ہیں اور ان سے جو نتائج ہمیں مل رہے ہیں، وہ بہت حوصلہ افزا ہیں۔ مثلاً سلمان آصف صاحب ہی کے تین بچوں کی ہوم اسکولنگ کی وڈیو یوٹیوب پر موجود ہے، جس میں ان بچوں نے خود بتایا ہے کہ کس طرح وہ اسکول کے بچوں سے آگے ہیں۔ اسی طرح کچھ فیملیز سے میری ملاقات ہوئی ہے، جو اپنے بچوں کی ہوم اسکولنگ کافی عرصے سے کر رہی ہیں اور وہ بھی بہت خوش ہیں۔ وہ والدین کہتے ہیں کہ اسکول کی بھاری بھرکم فیس اور اس سے بھی زیادہ والدین کی دوڑیں لگوا کر ان کی توانائی، جو اسکول ضائع کرواتا ہے، وہ سب بچ جاتی ہے اور زندگی میں سکون آجاتا ہے۔ پھر یہ توانائی اور پیسے اپنے بچوں پر خرچ کیے جاتے ہیں، جن سے بہت اچھے نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ ایک صاحب نے بتایا کہ وہ اسکول کی فیس کے پیسے ایک جگہ جمع کرتے رہتے ہیں اور ان پیسوں سے بچوں کو مختلف معلوماتی سفر کرواتے ہیں، جس سے بچے بہت کچھ سیکھتے ہیں، جو اسکول میں رہ کر کبھی نہیں سیکھ سکتے۔

ہوم اسکولنگ سے متعلق سوالات و جوابات

پہلا سوال یہ کہ ہوم اسکولنگ کے بچے اسکول میں پڑھنے والے بچوں سے پیچھے تو نہیں رہ جائیں گے ؟اس کا جواب ہم پہلے ہی اوپر اعداد و شمار کے ذریعے دے چکے ہیں۔ بچے اعلیٰ تعلیم اور جاب کیسے حاصل کریں گے ؟اس کا جواب بھی اوپر گزر چکا ہے۔ بچوں کی سوشل ضروریات کا کیا ہوگا؟اس کے لیے مختلف چیزیں ہوم اسکولنگ میں کی جا سکتی ہیں؛ جیسے سفر کرنا، چاہے وہ رشتے داروں سے ملنے جانا ہو یا کسی تاریخی مقام یا میوزیم وغیرہ جانا ہو۔ بچے کیسے سیکھیں گے ؟اس کے لیے ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ بچوں کو سیکھنے کا ماحول دینا ہوگا۔ سیکھنے سے مراد صرف کتابی نہیں بلکہ پریکٹیکل سیکھنا بھی ہے جیسے فارمنگ کرنا وغیرہ جس میں بچے کو بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ ہوم اسکولنگ ایک طویل موضوع ہے جس پر دنیا بھر میں بہت کتابیں لکھی جا چکی ہیں مگر راقم نے اس مختصر سے مضمون میں کوشش کی ہے کہ ہمارے معاشرے میں اس سے متعلق جو غلط فہمی پائی جاتی ہے اس کا ازالہ کیا جا سکے اور ساتھ ساتھ اسکول ہمارے بچوں کے ساتھ جو کھلواڑ کر رہا ہے اس کو کسی حد تک بے نقاب کیا جائے۔

حوالہ جات

برینی بنچ ہارڈنگ فیملی کی کتاب

https://www.amazon.com/Brainy-Bunch-Harding-Familys-)

(College/dp/1476759340

سلمان آصف صاحب کے تین بچوں کی ہوم اسکولنگ پر ڈاکومینٹری ویڈیو

(https://www.youtube.com/watch?v=q2hP_oNysjE)

جان ہالٹ کی کتاب ’’لرننگ آل دا ٹائم‘‘

(https://www.amazon.com/Learning-All-Time-John-Holt/dp/0201550911)

جان ٹیلر گیٹو کی کتاب ’’وپین آف ماس انسٹرکشن‘‘

https://www.amazon.com/Weapons-of-Mass-Instruction-)

(/audiobook/dp/B00BLR1S4S

جان ٹیلر گیٹو کی کتاب ’’ڈمبنگ اس ڈاون‘‘

https://www.amazon.com/Dumbing-Down-Curriculum-Compulsory-)

(Anniversary/dp/0865714487

این ایچ ای آر آئی کے اعداد و شمار

https://www.nheri.org/how-many-homeschool-students-are-there-in-the-)

(/united-states-during-the-2021-2022-school-year

*****

صوفی جمیل الرحمن عباسی
مدیر ماہنامہ مفاہیم و ناظمِ شعبہ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۱۷)

سلطنتِ عثمانیہ اور دوسرے مذاہب

عثمانی سلطنت میں دوسرے مذاہب کو مذہبی آزادی حاصل تھی اور ان کے جان و مال محفوظ رہتے تھے۔ فلسطین جب سے عثمانی قبضے میں آیا، یہاں بھی دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو زیارت اور عبادت کی اجازت حاصل تھی۔ عیسائی یہاں بھی اور پوری سلطنت میں مختلف مقام پر آباد تھے۔ عثمانی یہود و نصاریٰ کے علاوہ خارجی یہود و نصاریٰ کو بھی زیارت و عبادت کی اجازت حاصل تھی۔ عیسائیوں میں بہت سے فرقے تھے جن کی باہم چپقلش جاری رہتی تھی۔ فرقے اپنے طور پر زیارت کے اجازت نامے لیتے رہے اور امتیازات کے لیے کوشاں رہتے اور کبھی ان میں باہم لڑائی بھی ہو جایا کرتی تھی۔ مختلف ممالک مثلاً فرانس، پرتگال، ہسپانیہ وغیرہ اپنے لوگوں کے لیے سہولیات کے لیے کوشاں رہتے۔

سلطنت کی کمزوری اور اقلیتوں کی سرکشی

اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں مختلف معاہدوں کے تحت بہت سارے یورپی علاقے سلطنتِ عثمانیہ سے جزوی یا کلی آزادی پا چکے تھے اور سلطنتِ عثمانیہ کو بھاری سیاسی و مالی نقصانات اٹھانا پڑے تھے۔ اب اقوامِ یورپ سلطنت کے خاتمے کے ساتھ ساتھ بیت المقدس کو اپنے انتظام میں لینا چاہتے تھے۔ سلطان عبد المجید کے دور میں ۱۸۵۳ء تا ۱۸۵۶ء کی روس عثمانی جنگ، جنگ القرم کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس جنگ میں مجبوراً ترکوں کو فرانس اور برطانیہ کی مدد لینا

پڑی۔ جنھوں نے روس کی عداوت میں عثمانیوں کی مدد کی۔ جنگ کے خاتمے پر معاہدۂ پیرس طے پایا جس میں اگرچہ کئی عثمانی علاقے روسی قبضے سے آزاد ہو گئے لیکن عثمانیوں کو کئی یورپی علاقوں کو نیم خود مختاری سے نوازنا پڑا جو آگے چل کر ان کی آزادی پر منتج ہوئی۔ عثمانیوں کو پابند کیا گیا کہ وہ اقلیتوں کے حقوق کے لیے قانون سازی کر کے ان کی سہولیات میں اضافہ کریں گے اور یہ بھی کہ معاہدے کے فریق اس پیش رفت کا جائزہ لیتے رہیں گے۔ اس سے فرانس اور برطانیہ کا سلطنت کے معاملات میں عمل دخل بڑھ گیا۔ اس دور میں سلطنت اور بالخصوص قدس میں عیسائی زائرین کی ریل پیل ہو گئی۔ مخصوص ایام میں تو قدس کی آبادی سے زیادہ زائرین آجاتے۔ ۱۸۵۶ء میں سلطان عبدالمجید کی طرف سے ایک ضابطہ ''خطِ ہمایوں'' جاری کیا گیا جس میں تمام شہریوں کو بلا تفریق مذہب و نسل مساوی حقوق دیے گئے۔ مسلم غیر مسلم کی تفریق ختم کرنے کے ساتھ اس میں غیر مسلموں پر عائد جزیہ بھی ختم کر دیا گیا۔ اس قانون کی رو سے کسی بھی عثمانی شہری کو دین و مذہب کی شرط کے بغیر حکومتی مناصب پر فائز کیا جا سکتا ہے۔ اس اعلامیے میں قرار دیا گیا کہ اپنا دین ترک کرنے پر کسی کو کوئی سزا نہیں دی جائے گی اور ہر بندے کو اپنی پسند کا دین اختیار کرنے کی اجازت ہے۔

یہود اور سبتائی فرقے کا ظہور

یہود، خلافتِ عثمانیہ کے ابتدائی دور ہی سے سلطنت میں قیام پذیر تھے۔ خلیفہ سلیمان القانونی (۱۰۷۳ھ/۱۵۶۶ء) کو تاتاریوں نے ایک روسی یہودی کنیز تحفے میں بھیجی تھی۔ سلیمان القانونی کا ولی عہد سلیم ثانی اسی یہودن کا بیٹا تھا۔ یہودی کنیز کی کوششوں سے سلطان سلیمان نے یہود کو اپنی سلطنت میں آباد ہونے کی اجازت دی اور انھیں ازمیر، ادرنہ، بورصہ وغیرہ میں آباد کیا۔ البتہ فلسطین اور سینا میں انھیں آباد ہونے کی اجازت نہ تھی۔ عثمانی سلطنت میں یہودیوں کو نہ صرف پناہ ملی بلکہ خوش حالی اور مذہبی آزادی سے بھی وہ خوب لطف اندوز ہوئے۔ یہودیوں کو بھی مذہبی آزادی حاصل تھی اور سلطنتِ عثمانیہ کا شہری بن کر وہ کہیں بھی رہ سکتے تھے البتہ یہ کہ قدس میں ان کو قیام پذیر ہونے کی اجازت نہ تھی۔ یہاں یہودیوں میں ایک گروہ پیدا ہوا جسے ترک زبان میں دونمہ کہا گیا جو ظاہری طور پر مسلمان ہو جاتے لیکن بہ باطن یہودیت پر قائم رہتے۔ ان کے عقائد و اعمال میں مسلم و یہود، دونوں کی آمیزش پائی جاتی تھی۔ اس فرقے کی بنیاد سبتائی زیفی نے رکھی جس نے اپنا اسلامی نام محمد آفندی رکھا

تھا۔ یہ ہسپانوی الاصل یہودی تھا لیکن اس کی پیدائش ترکی میں ہوئی۔ ۱۶۴۸ء میں اس نے خود کو مسیح منتظر، سلیمان بن داؤد علیہ السلام کا پرتَو، ملک الملوک اور سلطان السلاطین وغیرہ کہنا شروع کیا۔ اس نے یہ نظریہ عام کیا کہ اس کے ذریعے سے فلسطین پر یہودی حکومت قائم ہوگی جو پوری دنیا پہ راج کرے گی۔ عثمانی وزیر احمد کوپریلی نے اسے گرفتار کر کے گیلا پولی قلعے میں قید کر دیا، بعد میں ایک خصوصی عدالت کے سامنے اسے پیش کیا گیا تاکہ وہ اپنے دعویٔ مسیحیت کو ثابت کر سکے لیکن وہ بظاہر مسلمان ہو گیا اور اس کے بعد وہ یہود میں اسلام کی دعوت دینے لگا۔ لیکن درپردہ یہ دینِ موسوی اور صیہونیت کی دعوت تھی، وہ لوگوں کو اسلام ظاہر کرنے اور بہ باطن یہودیت پر قائم رہنے کی تلقین کرتا۔ بعد میں اس کی ریشہ دوانیاں اور بدکاریاں سامنے آنے پر اسے دوبارہ گرفتار کیا گیا۔ اگرچہ اس کی موت کا فیصلہ کر لیا گیا تھا لیکن اس اندیشے کے تحت کہ اس کے مریدین اس کے قتل پر رفعِ آسمانی کا عقیدہ گھڑ لیں گے جو اس کی دعوتِ بد کے مزید پھیلاؤ کا ذریعہ بنے گا، اسے ملک بدر کر دیا گیا۔ سلطنتِ عثمانیہ میں اباحیت اور لبرل ازم پھیلنے کا ایک بڑا ذریعہ یہی فرقہ بنا۔ سالونیک ان کا مضبوط گڑھ تھا۔

یہود کی فلسطین میں آبادکاری

فلسطین میں آباد ہونا اور یہاں اپنی قومی ریاست قائم کرنا یہودیوں کا قدیم خواب تھا جیسا کہ یہود کے دونمہ فرقے کے بانی سبتائی زیفی کے ہاں اس کا تذکرہ ہم پڑھ چکے۔ دورِ جدید میں اس کی اولین صدا نپولین بونا پارٹ کی جانب سے آئی۔ انیسویں صدی کے بالکل شروع میں جب مصر فتح کرنے کے بعد اس نے فلسطین کے شہر عکا پر حملہ کیا تو اس نے فلسطین میں یہود کے قومی وطن کے قیام کا اعلان کیا۔ خدا کی شان کہ عکا میں اسے شکستِ فاش کا سامنا کر کے چپکے سے فرانس بھاگنا پڑا۔ انیسویں صدی میں سلطنتِ عثمانیہ کی کمزوری ''عروج'' پر پہنچ چکی تھی۔ یہود کو اپنی منزل دو گام نظر آ رہی تھی چناں چہ انھوں نے اپنی کوششیں تیز کر دیں۔ ان کے پاس دولت تھی اور ''دولت کے ہاتھ صحافت'' تھی چناں چہ انھوں نے عالمی صحافت اور عالمی سیاست میں اپنے منصوبے کے لیے زمین ہموار کرنا شروع کی۔ شافٹسبری کے نواب اور برطانوی رکن پارلیمان لارڈ انتھونی کوپر نے مختلف اخبارات میں یہود کی واپسی اور ان کے قومی وطن کی تشکیل کے بارے میں متعدّد مضامین اخبارات میں شائع کیے۔ اسی نے ۱۸۳۸ء میں برطانوی وزیرِ خارجہ پالمرسن سے درخواست کی کہ وہ فلسطین میں یہودی مملکت کے

قیام کے لیے کوشش کرے۔

سفارت خانوں کا قیام

مختلف حکومتوں کا دوسرے ملک میں اپنے سفارت خانے قائم کرنے کا رواج قدیم عرصے سے چلا آرہا تھا۔ جو عام طور پر دار الحکومتوں میں ہوا کرتے تھے۔ فلسطین میں پہلا سفارت خانہ برطانیہ نے ۱۸۳۷ء میں قائم کیا۔ ۱۸۳۱ء سے ۱۸۴۱ء؛ یہ وہ دور تھا جب والیِ مصر محمد علی پاشا نے نپولین کے حملے کے بعد مصر میں خود مختاری کا اعلان کرنے کے بعد فرانس کی اشیرباد سے شام اور فلسطین پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۱۸۴۱ء میں عثمانیوں نے شام پر سے مصری قبضہ چھڑایا لیکن فلسطین میں برطانوی سفارت خانہ قائم ہی رہا۔ اس کے بعد مختلف ادوار میں قدس میں مغربی طاقتوں کے سفارت خانے قائم ہونے لگے، ۱۸۵۸ء میں روسی سفارت خانہ کھولا گیا، ۱۸۸۵ء میں جرمنی کا سفارت خانہ، ۱۸۸۶ء میں بروسیا کا سفارت خانہ قائم کیا گیا۔ یہ دفاتر سفارت کاری سے زیادہ یہود کے لیے سہولت کاری کرتے تھے۔

فرنگی اداروں اور یہودی بستیوں کا قیام

یہود و نصاریٰ کی ایک یہ کوشش بھی تھی کہ سرزمینِ قدس میں زیادہ سے زیادہ ادارے قائم کیے جائیں جو ایک طرف تو ان کی ثقافت و سیاست کو فروغ دینے کا ذریعہ ہوں اور دوسری طرف یہود کے لیے پناہ گاہوں کا کام دیں۔ ان اداروں میں کبھی تو خفیہ اور کبھی اعلانیہ یہودی بستیاں قائم کر لی جاتی تھیں۔ ۱۸۵۴ء میں یہود نے قدس میں ایک کنیسہ بنانے کی اجازت طلب کی جو انھیں نہ دی گئی، اس پر انھوں نے برطانیہ سے ساز باز کر کے پروٹسٹنٹ کے لیے گرجا تعمیر کرنے کی اجازت طلب کی، جو دے دی گئی۔ ۱۸۵۶ء میں صلاح الدین ایوبی کا قائم کردہ مدرسہ الصلاحیہ فرانس کے حوالے کرنا پڑا۔ عیسائیوں نے یہاں اپنا گرجا تعمیر کیا۔ ۱۸۶۴ء میں صلاح الدین ہسپتال (بیمارستانِ صلاحی) سے ملحق کچھ ویران زمین جرمنی کے حوالے کی گئی جہاں جرمنی نے ایک گرجا تعمیر کیا۔ ۱۸۵۹ء میں برطانوی یہودی سرمایہ دار موشے مونٹیفور نے سلطان عبد المجید سے یافا اور قدس میں، ہسپتال کی تعمیر کے لیے زمین خریدنے کی اجازت حاصل کی جو اس سے پہلے ممنوع تھی۔ موشے نے اس

کے علاوہ ایک قطعۂ زمین اور بھی خریدا۔ بعد میں اس نے ہسپتال کے ساتھ یہودی بستی قائم کرنے کی کوشش کی تو فلسطین کے گورنر نے تعمیرات رکوا دیں۔ لیکن برطانوی سفارت خانے کی مداخلت سے استنبول سے اجازت کی تجدید کرائی گئی۔ چناں چہ یہاں یہودی بستی بنالی گئی جو محلہ مونٹیفور کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اسی طرح کی چالوں سے جرمن یہودیوں کی ایک بستی ۱۸۷۴ء میں بھی قائم کی گئی جو ابتدائی طور پر "۲۷۵" افراد پر مشتمل تھی۔

سلطان عبدالحمید ثانی

سلطان عبد الحمید ثانی ۱۸۷۶ء میں تخت نشین ہوئے اور ۱۹۰۹ء تک تختِ خلافت پہ رونق افروز رہے۔ آپ حافظِ قرآن، پابندِ صوم و صلاۃ اور متدین شخص تھے۔ امورِ سیاست میں شاہی خواتین کی دخل اندازی کے خلاف تھے۔ آپ کی تخت نشینی کے وقت سلطنتِ عثمانیہ بہت مقروض ہو چکی تھی۔ سلطان عبد الحمید نے عثمانی دستور نافذ کیا جس کے تحت دو ایوان منتخب کیے گئے جس میں عیسائیوں اور یہودیوں کو بھی ان کے حجم کے مطابق نمائندگی دی گئی۔ لیکن جلد ہی وزیرِ اعظم مدحت پاشا اور ان کے حامی جمہوریت پسندوں سے ان کے اختلاف ہو گئے۔ مدحت پاشا چاہتے تھے کہ صوبوں کے گورنر کے منصب پر عیسائیوں کو بھی متعیّن کیا جائے اور عثمانی فوجی سکولوں میں عیسائیوں کو داخل کیا جائے اور عثمانی فوج سے الگ اور بااختیار فوج تشکیل دی جائے جس میں عیسائیوں کو بھی نمائندگی حاصل ہو۔ ان اختلافات پر انھوں نے دستور معطل کر دیا اور سابقہ حیثیت میں شخصی حکومت کو جاری رکھا۔ سلطان نے متعدّد مواقع پر اس کا اظہار کیا کہ بہت سارے اعیانِ سلطنت عالمی طاقتوں کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں اور وہ سلطنت کو ختم کرنے پر رشوت لے رہے ہیں۔ سالونیک کے منافق فرقے کی حقیقت سے بھی آپ باخبر تھے جیسا کہ آپ نے اپنی ڈائری میں تفصیل سے لکھا ہے۔ آپ انھیں مرکز سے دور رکھنے کی کوشش کرتے تھے اور ان کی سازشوں کا مقابلہ کرتے لیکن ترکی کے داخلی حالات اور یورپی طاقتوں کی نظر اور اس فرقے کا اندرونِ سلطنت اور بیرونِ سلطنت پھیلاؤ اور وسعت کسی بڑے اقدام کی اجازت نہ دیتی تھی۔ فوج اور مختلف مناصب پر انھوں نے خاص محنت کی۔ ایک موقعے پر انھوں نے کہا کہ مغربی طاقتیں ایک طرف تو ہماری عیسائی رعایا کو ہمارے خلاف اکسا رہی ہیں اور دوسری طرف ہمیں جمہوریت کی راہ پر ڈال رہی ہیں۔ ان کے پیشِ نظر نہ عوام کے حقوق ہیں اور نہ ہی

جمہوریت بلکہ ہماری ریاست میں تفرقہ اور انتشار پھیلانا ان کے پیشِ نظر ہے۔ سلطان نے قدس میں یہودیوں کے داخلے اور عمل دخل کو محدود کرنے کے لیے متعدّد بار قانون سازی کی لیکن سلطنت میں رشوت ستانی کے سبب ان احکامات پر پوری طرح عمل نہ ہوسکا۔

جاری ہے

*****

مفتی نذیر احمد ہاشمی مدظلہ
ضبط و ترتیب: مولانا عابد علی

القواعد الفقهية

القاعدة الخامسة: الأمر إذا ضاق اتسع

جب کسی کام میں شدید تنگی ہوگی، تو اس میں وسعت دی جائے گی

تشریح

شرعی احکامات عمومی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اس میں ہر ہر شخص کے لیے علیحدہ قانون نہیں بنایا جاسکتا۔ اس لیے بعض دفعہ کسی شخص کے ذاتی حالات اس طرح کے ہوتے ہیں کہ اس عمومی حکمِ شرعی پر عمل حرج کا باعث بنتا ہے تو ایسی صورت میں شریعت نے کچھ اصول متعیّن کیے ہیں جن کی مدد سے اس مشقت کو دور کیا جاسکتا ہے۔ اور جس قدر ضرورت ہو اس معاملے میں آسانی پیدا کی جاتی ہے۔ اور جب وہ مشقت دور ہو جائے تو اصل حکمِ شرعی واپس لوٹ آتا ہے۔ اس بات کو فقہاے کرام رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں: الأمرُ إذا ضَاقَ اِتَّسَعَ

مثالیں

(۱) عام حالات میں کسی شخص پر قرض ہو تو اس پر ادائی کے لیے جبر کیا جاسکتا ہے، لیکن جب مدیون (قرض دار) نادار ہو اور اس کی طرف سے کوئی کفیل (قرض ادا کرنے کی ذمے داری لینے والا) بھی موجود نہ ہو تو اس کے مالدار ہونے کی حالت کا انتظار کرنا ہوگا اور اگر وہ پورا دین (قرض) ایک ساتھ ادا کرنے پر قدرت نہ رکھتا ہو تو اس کے ساتھ قسط مقرر کر کے تعاون کیا جائے گا۔ کیوں کہ مال نہ ہونے کی وجہ سے اسے اور مشقت میں نہیں ڈالا جائے گا اور اسے وسعت دی جائے گی۔

(۲) عام حالات میں شریعت نے صرف مردوں کی گواہی کو معتبر ٹھہرایا ہے اور عورت کی گواہی تبھی معتبر ٹھہرائی ہے جب وہ

کسی مرد کی گواہی کے ساتھ ملی ہو ورنہ صرف عورتوں کی گواہی معتبر نہیں ہے، لیکن بعض مسائل میں ایسے مقامات وحالات جہاں مردوں کی حاضری اور واقفیت مشکل یا ناممکن ہو، ان مقامات پر عورتوں کی گواہی قبول کی جاتی ہے ورنہ لوگوں کے حقوق کے ضایع ہونے کا اندیشہ ہے، جیسے بچے کے نسب اور پرورش کے حق کی حفاظت کے لیے بچے کی ولادت پر صرف ایک دایہ کی گواہی کا قبول کرنا کیوں کہ اس موقعے پر مرد موجود نہیں ہوتے اور اگر مردوں کی گواہی ہی قبول کی جائے تو بہت مشقت لازم آئے گی۔

(۳) زندگی کی حفاظت کے لیے مرے ہوئے جانور کا گوشت کھالینا یا کسی اور شخص کے مال کو استعمال کرلینا شریعت نے جائز قرار دیا ہے۔ حالات بہتر ہونے پر اس شخص کو اس چیز کی رقم واپس کرنے کی اجازت ہے۔ شریعت نے جان بچانے کے لیے اس مشکل وقت میں نرمی کا معاملہ رکھا ہے۔

(۴) وفات کی عدت گزارنے والی عورت کے لیے اگر کوئی کمانے والا نہ ہو تو اس کی زندگی میں بہت حرج میں آنے کا اندیشہ ہے، اس لیے شریعت نے اس معاملے میں نرمی کرتے ہوئے دن کے وقت میں معاش کے حصول کے لیے باہر جانے کی اجازت دی ہے۔

(۵) شریعت میں متعیّن نیکی کے کاموں کی ادائیگی کے لیے کسی شخص کو اجرت پر رکھنے کی اجازت دی گئی ہے۔ مثلاً تعلیمِ قرآن یا اذان کے لیے معلم یا موذن کی خدمات معاوضہ دے کر وصول کرنے کی اجازت دی گئی، جو فقہاے متاخرین کا مفتٰی بہ قول ہے۔ کیوں کہ اگر کسی کو معاوضہ دے کر یہ کام نہ کروائے جائیں تو اندیشہ ہے کہ دین کی حفاظت وابلاغ کا کام کرنے والا کوئی نہ ہو۔

(۶) کسی شخص کو حملہ آور، چور اور باغی سے اپنے آپ کو بچانے لیے اسے زخمی یا قتل کرنا بھی جائز ہے۔ کیوں کہ ان ظالمین سے اگر اس قسم کا دفاع جائز نہ کیا جائے تو پھر لوگوں کو شدید مشقت لاحق ہوگی اور اس طرح وہ ان ظالموں کے رحم وکرم پر ہوں گے۔ اور ان ظالموں اور مفسدین کو لوگوں پر ظلم کرنے کی آزادی مل جائے گی۔ حالاں کہ اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے۔ اس لیے حملہ کرنے والے کو اپنے دفاع کے لیے زخمی کرنا یا قتل کرنا بھی جائز ہے۔

*****

فتاویٰ یسئلونک

دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

پانچ موذی جانوروں کو مارنے والی حدیث کی وضاحت

سوال: صحیح بخاری کے حوالے سے ایک حدیث موصول ہوئی جس کا مفہوم یہ ہے کہ پانچ موذی جانور ہیں جنھیں حدودِ حرم میں بھی مارا جاسکتا ہے: چوہا، بچھو، چیل، کوا اور کاٹ لینے والا کتا۔ اس حدیث کی وضاحت فرمادیں اور کیا حرم کے باہر بھی ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب: حدیث شریف میں مذکورہ پانچ جانوروں کو حالتِ احرام میں مارنے کی اجازت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ان جانوروں کو حرم سے باہر مارنا بدرجۂ اولی جائز ہے اور بعض روایات میں یہ اجازت صراحتاً محرم اور حلال دونوں کے لیے ثابت ہے۔ مسلم شریف میں ہے: قَالَ عَبْدُ اللهِ سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: «خَمْسٌ مِنَ الدَّوَابِّ لَا جُنَاحَ عَلَى مَنْ قَتَلَهُنَّ، فِي قَتْلِهِنَّ: الْغُرَابُ، وَالْحِدَأَةُ، وَالْعَقْرَبُ، وَالْفَأْرَةُ، وَالْكَلْبُ الْعَقُورُ» (مسلم، كتاب الحج، باب ما يندب للمحرم وغيره قتله من الدواب في الحل والحرم) ترجمہ: ”حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا: پانچ جانور ایسے ہیں کہ ان کے قتل کرنے والے پر کوئی حرج نہیں کوا، چیل، بچھو، چوہا، باؤلا کتا“۔

ایک اور روایت میں ہے: عَنْ عَائِشَةَ، أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: «خَمْسٌ فَوَاسِقُ، يُقْتَلْنَ فِي الْحِلِّ وَالْحَرَمِ: الْحَيَّةُ،

وَالْغُرَابُ الْأَبْقَعُ، وَالْفَأْرَةُ، وَالْكَلْبُ الْعَقُورُ، وَالْحِدَأَةُ»(سنن ابن ماجه، كتاب المناسك، باب ما يقتل المحرم) ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پانچ فاسق جانور ہیں ان کو حرم سے باہر اور حرم میں قتل کیا جائے گا سانپ، کوا، چوہا، باؤلا کتا، چیل۔

واللہ اعلم بالصواب

۲۱، جمادی الاولی ۱۴۴۱ھ بمطابق ۱۷، جنوری ۲۰۲۰ء

فتوی نمبر: ۴۲۷۸

*****

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ! اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور توفیق سے ماہنامہ مفاہیم کراچی کی آن لائن اشاعت کو دو سال مکمل ہو گئے۔ ماہنامہ مفاہیم کی مجلسِ ادارت اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور نبی پاک ﷺ پر درود و سلام کے بعد تمام مصنفین و قارئین کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتی ہے کہ انھوں نے اس رسالے کو بہتر بنانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔

مجلسِ ادارت امید کرتی ہے کہ آپ کی طرف سے اسی طرح عمدہ مضامین اور قیمتی آرا موصول ہوتی رہیں گی اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعاگو ہے کہ ماہنامہ مفاہیم روز افزوں ترقی کرے، امتِ مسلمہ کے لیے نافع بنے اور اس کے تمام متعلقین خالصتاً اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اس کی ترقی میں کوشاں رہیں۔ آمین

شیخ علی محمد، مقبوضہ کشمیر
معاون قلم کار

اقبال اور کشمیر

یومِ اقبال کی مناسبت سے خصوصی تحریر

علامہ محمد اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء بمطابق ۳ ذوالقعدہ ۱۲۹۴ھ کو برطانوی ہند کے شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ علامہ اقبال کے آباؤ اجداد کشمیر وادی کے کولگام علاقے کے مکیں تھے۔ ذرا پیچھے جاکر یہ ہندو براہمنوں کا معزز خاندان تھا لیکن اسلام کی حقانیت نے اس خاندان کو اپنے اندر جذب کرلیا۔ چونکہ کشمیر ہندوستان کا حصہ نہیں تھا اور مختلف زمانوں میں یہاں مختلف خود مختار فرماں روا رہے، ان میں ہندو راجہ اور بدھسٹ حکمران بھی گزرے ہیں اور مسلمان حاکم اور بادشاہ بھی، ان ادوار میں ڈوگرہ شاہی کا ایک دورِ سیاہ بھی تھا، اس کا آغاز ۱۸۴۶ء کے معاہدۂ امرتسر سے ہوا جس کو بیع نامۂ امرتسر بھی کہتے ہیں۔ اس معاہدے کے تحت سات لاکھ روپیہ کے عوض کشمیر کو گلاب سنگھ (ڈوگرہ) کے ہاتھ فروخت کردیا گیا۔ ڈوگرہ راج مسلمانوں کے لیے بہت ہی اذیت ناک دور تھا اور بہت سے مسلمان ان کی چیرہ دستیوں سے بچنے کے لیے ہجرت کرگئے، زیادہ تر نے متحدہ پنجاب کا رخ کیا اور آج بھی کشمیر سے باہر جو شیخ، بٹ، میر اور ڈار وغیرہ برادریاں پائی جاتی ہیں وہ سب کشمیری نژاد ہیں، ان میں زیادہ تر لوگ اسی دور میں ہجرت کرگئے ہیں۔ علامہ اقبال کے خاندان نے بھی اسی دور میں پنجاب کا رخ کیا اور سیالکوٹ میں آباد ہوا۔ لیکن علامہ کے رگ وپے میں کشمیر کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور کشمیری مسلمانوں کی زبوں حالی پر سخت متفکر تھے، کشمیری مسلمانوں کے حقوق کے لیے جو کچھ کوشش حالات کے مطابق ہوسکتی تھی اس میں پیش پیش رہے، کشمیر کی مخدوش صورت حال کا تذکرہ آتے ہی اقبال رنجیدہ اور ملول ہوتے تھے۔ علامہ کے کلام، خطوط اور ملاقاتوں

میں جابجا اس کا ثبوت ملتا ہے۔علامہ اقبال نے کشمیر میں اسلام کے بانی حضرت شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ پر ایک نظم رقم فرمائی ہے اس میں اور باتوں کے علاوہ بیع نامۂ امرتسر کے بارے میں اپنے کرب کا یوں اظہار کیا:

بادِ صبا اگر بہ جنیوا گُزر کُنی
حرفے زِ ما بہ مجلسِ اقوام باز گوئے
دہقان وکشت و جوئے و خیابان فروختند
قومے فروختند و چِہ ارزان فروختند

(بادصبا! اگر جنیوا کی طرف تیرا گُزر ہو تو ہماری ایک بات مجلسِ اقوام تک پہنچا دینا۔دہقان، اس کی کھیتی، ندیاں، پھولوں کی کیاریاں سب کو فروخت کر دیا، ایک قوم کو فروخت کر دیا اور کس قدر سستا فروخت کر دیا) غرض اقبال کا دل کشمیر کے ساتھ دھڑکتا تھا۔

نوٹ: اقوامِ متحدہ سے پہلے جو عالمی تنظیم تنازعات حل کرنے کے نام پر بنائی گئی تھی اس کا نام لیگ آف نیشنز تھا اور اس کا صدر دفتر سوئیزرلینڈ کے شہر جنیوا میں تھا۔

جب متحدہ ہندوستان کے باشندے اپنے حقوق اور آزادی کے لیے اپنی قد آور لیڈر شپ کے تحت انگریزوں کے ساتھ نبرد آزما تھے تو اس وقت گو یہ ریاست بظاہر کسی بیرونی طاقت کے زیرِ تسلط نہیں تھی لیکن اندرونی طور پر ڈوگرہ شاہی کا عفریت اس کی اکثریت (مسلمانوں) کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا لیکن کوئی قد آور لیڈر شپ ان کو میسر نہیں تھی اس بارے میں علامہ فرماتے ہیں:

بیدار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے
اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب

ایک اور جگہ فرمایا:

نصیبِ خطہ ہو یارب وہ بندۂ درویش
کہ جس کے فقر میں انداز ہوں کلیمانہ

اور ستم ظریفی دیکھیے کہ اقبال کی دعاؤں سے جب وہ مردِ درویش سید علی شاہ گیلانی کے نام سے پیدا ہوا تو جس قوم کی آزادی کا خاکہ ۱۹۳۰ میں اپنے خطبہ الہ آباد میں پیش کیا اور اسی بنیاد پر ایک آزاد مملکت کا وجود ممکن ہوا، اسی قوم کے اربابِ اختیار نے اقبال کے سچے جانشین اور مردِ قلندر اور اس کی قوم کے ساتھ مصلحتوں کے پیشِ نظر آنکھ مچولی شروع کردی۔ البتہ وہاں کے عوام کا دل علامہ کی طرح ہمیشہ کشمیر کے ساتھ دھڑکتا رہا۔ علامہ اقبال کشمیر کے ساتھ اپنی نسبت کو یوں بیان کرتے ہیں:

تنم گلے زِ خیابانِ جنّتِ کشمیر
دل از حریمِ حجاز و نوا زِ شیراز است

(میرا بدن جنت کشمیر کے چمن کا ایک پھول ہے، دل حریم حجاز سے ہے، اور نوا شیراز سے)

اقبال کشمیر کے مناظرِ قدرت کا مشاہدہ کرنے کی دعوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

رخت بہ کاشمر گشا کوہ و تل و دمن نِگر
سبزہ جہان جہان بِبین لالہ چمن چمن نِگر
بادِ بہار موج موج مرغ بہار فوج فوج
صلصل و سار زوج زوج بر سر نارون نگر

(کشمیر کا سفر اختیار کر اور پہاڑ، ٹیلے اور وادیاں دیکھ، ہر طرف اگا ہوا سبزہ اور ہر چمن میں کِھلا ہوا لالہ دیکھ، باد بہار کی موجیں دیکھ، طائرانِ بہار کے پرے کے پرے دیکھ، نروان کے درخت پر قُمریوں اور فاختاؤں کے جوڑے جوڑے دیکھ)

علامہ کی ایک نظم "زیارتِ حضرت سید علی ہمدانی و ملا طاہر غنی کشمیری" کے آخری اشعار پر اس مضمون کا خاتمہ کرتا ہوں:

شاعر رنگیں نوا طاہر غنی
فقرِ او باطن غنی، ظاہر غنی

(یہ رنگین نوا شاعر غنی ہے جس کا فقر اندر سے بھی اور باہر سے بھی بے نیاز ہے)

نغمۂ مے خواند آن مست مدام
در حضورِ سیدِ والا مقام

(یہ مست مدام شاعر سیدِ والا مُقام (علی ہمدانی) کے سامنے شعر پڑھ رہا ہے)

سیدُ السّادات، سالارِ عجم
دستِ او معمارِ تقدیرِ اُمم

(سیدوں کا سردار عجم کا سردار جس کا ہاتھ امتوں کی تقدیر بنانے والا ہے)

تا غزالی درسِ اللہ ہو گرفت
ذکر و فکر از دودمانِ او گرفت

(جب غزالی نے اللہ ہو کا سبق لیا تو سید علی ہمدانی کے خاندان سے ذکر و فکر کی تعلیم پائی)

مُرشدِ آں کشورِ مینو نظیر
میر و درویش و سلاطین را مشیر

(آپ جنت نظیر (کشمیر) کے مرشد تھے اور میر و درویش و سلاطین کے مشیر)

خطہ را آں شاہ دریا آستین
داد علم و صنعت و تہذیب و دین

(اس شاہ دریا آستین (فیاض) نے خطہ کشمیر کو علم و صنعت و تہذیب و دین سے نوازا)

آفرید آں مرد ایرانِ صغیر
با ہنر ہاے غریب و دلپذیر

(انھوں نے نادر اور دلپذیر فنون سے اس خطے کو ایرانِ صغیر بنا دیا)

یک نگاہِ او گشاید صد گرہ
خیز و تیرش را بدِل راہے بدِہ

(اس کی ایک نگاہ نے سینکڑوں گرہیں کھول دیں، اٹھ اور اس کے تیر کو اپنے دل میں جگہ دے)

علامہ اقبال کو بجا طور پر پاکستان کا نظریاتی باپ کہا جاتا ہے۔ انھیں پاکستان کے قومی شاعر کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جس زبان میں پاکستان کے اس قومی شاعر نے اپنے بیش بہا افکار پیش کیے، اس ملک کے اربابِ اختیار نے اسی زبان کو گویا دیس نکالا دے دیا اور منظم طور پر نئی نسل کو علامہ کے انقلابی فلسفے سے دور رکھنے کا سامان کر دیا۔

*****

سفرنامہ: مفتی اویس پاشا قرنی
ضبط و ترتیب: مولانا محمد اقبال

افغان نامہ (۴)

سفرِ افغانستان کی مختصر روداد

جہاد کے متعلق قوم پرستوں کے نام نہاد بیانیے کی حقیقت

جب ہم افغانستان کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کے نتیجے میں ایک بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ افغان معاشرہ ایک اسلامی اور قبائلی معاشرہ ہے، اس کی بنیادیں بہت مضبوط ہیں۔ مذہب؛ افغان قوم کی روایت و ثقافت کا ایک ایسا حصہ ہے جسے اس معاشرے کی اقدار کی مکمل نفی کیے بغیر جدا نہیں کیا جا سکتا اور افغان قوم اپنی روایات و اقدار کے متعلق انتہائی حساس اور غیر لچکدار واقع ہوئی ہے۔ جب بھی کسی نے ان روایات کے خلاف اقدامات کیے تو افغان ملت میں سخت اضطراب پیدا ہوا اور افغان قوم نے اس پر انتہائی ردِ عمل کا اظہار کیا۔ ماضی میں بعض ناعاقبت اندیش حکمرانوں نے جو یورپ کی تہذیب سے متاثر تھے، انھوں نے ترقی اور نام نہاد روشن خیالی کے نام پر اسلامی تعلیمات اور افغان روایات کے برعکس اقدامات کیے جیسے خواتین کی نام نہاد آزادی کے نام پر بے حیائی کو فروغ دینا، یورپی لباس کی ترویج اور تعلیمی اداروں میں مخلوط نظامِ تعلیم کی پذیرائی وغیرہ۔ ان روشن خیال حکمرانوں اور نام نہاد اصلاح پسندوں میں امیر امان اللہ خان کا نام سرِ فہرست ہے۔ وہ ترکی کے کمال اتاترک سے بہت متاثر تھے اور ان کی طرح اصلاحات افغانستان میں لانا چاہتے تھے، مگر افغانستان جیسے روایتی معاشرے میں روایت سے بغاوت اور جدیدیت کی طرف سفر کرنا آسان نہیں تھا۔ اس لیے امان اللہ خان کے خلاف بغاوت ہوئی اور اس بغاوت کے نتیجے میں امان اللہ خان ۱۹۲۹ء میں ملک چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ یہ بغاوت کی اصل اور

حقیقی وجہ تھی مگر آج کل قوم پرستوں نے اس بنیادی وجہ سے آنکھیں بند کر کے اسے برطانوی سازش کا افسانہ بناکر متعارف کرایا ہے اور ان کا دعویٰ ہے کہ انگریز نے یہاں کے مذہبی رہنماؤں کے ساتھ مل کر افغانستان میں تباہی مچائی۔ بدقسمتی سے افغانستان کی جدید تعلیم یافتہ نئی نسل اس پورے پسِ منظر سے ناواقف ہے اور قوم پرستوں کے اس بیانیے کو ہی درست سمجھتی ہے۔ ممکن ہے انگریز نے امیر امان اللہ خان کے خلاف عوامی احتجاج کو اپنے حق میں استعمال کیا ہو اور افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی ہو، مگر اس احتجاج کی نوبت کیوں آئی اور مداخلت کا موقع کس نے فراہم کیا؟ اس پر غور کرنے کے لیے شاید کسی کے پاس وقت نہیں ہے، ورنہ بخوبی اس بغاوت کی حقیقی وجہ سامنے آجاتی۔ اگر امان اللہ خان مغربی تہذیب کو اپنی قوم پر مسلط نہ کرتے تو احتجاج کی نوبت ہی نہ آتی۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ امیر امان اللہ خان کے بعد ان کے بعد برسراقتدار آنے والے نادر شاہ نے ان جدت زدہ اقدامات کی اصلاح کا ارادہ کیا اور اپنی تہذیب و روایات کے مطابق تعلیمی نظام بنانے کے لیے شاعر مشرق علامہ محمد اقبال، حضرت مولانا سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کو مشاورت کے لیے مدعو کیا۔ اپنی پہلی ملاقات میں نادر شاہ نے علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے اپنے اس ارادے کا اظہار یوں کیا: ”میری کوشش ہے کہ افغانستان میں دین و دنیا کو جمع کروں اور ایک ایسے اسلامی ملک کا نمونہ پیش کروں جس میں قدیم اسلام اور جدید تمدن کے محاسن یکجا ہوں“۔ (سیرِ افغانستان، سید سلیمان ندوی، ص:۶۲) اسی طرح اسی دورے میں علامہ محمد اقبال نے نادر شاہ کی شخصیت کا جو مشاہدہ کیا تھا اسے کابل میں ایک جلسے میں اس طرح بیان کیا: ”مجھے خوشی ہے کہ افغانستان کو ایک ایسا مرد کامل مل گیا ہے جس کا وہ عرصے سے انتظار کر رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اعلیٰ حضرت نادر شاہ کی شخصیتِ ایجاد کار کو اسی لیے پیدا کیا گیا ہے کہ افغانستان کو ایشیا میں ایک نئی قوم بناکر دنیا سے تعارف کرائیں۔ اس وطن کے نوجوانوں کو چاہیے کہ اس بزرگ رہنما کو اپنی تعلیم و تربیت کا معلم سمجھیں کیونکہ ان کی تمام زندگی ایثار، اخلاص اور اپنے ملک کے ساتھ صداقت اور اسلام کے ساتھ عشق و محبت سے لبریز ہے“۔ (سیرِ افغانستان، سید سلیمان ندوی، ص:۸۴) نادر شاہ اپنے پیش رو کی بے اعتدالیوں سے خوب واقف تھے اور اس لیے انھوں نے ان تمام لوگوں کو واپس بلایا جنھوں نے امیر امان اللہ کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ مگر قدرت نے یاوری نہیں کی، نادر شاہ جیسی شخصیت کو شہید کر دیا گیا۔ خلاصہ یہ کہ امیر

امان اللہ خان نے افغانستان میں جس طرح اصلاحات کے نام پر مغربی تہذیب کی طرف پیش رفت کرنا چاہی اس کا ردِ عمل آنا فطری تھا، اسے روکا نہیں جا سکتا تھا اور اس کے ساتھ نادر شاہ جیسے نیک حکمران نے موافقت اس لیے نہیں کی کہ یہ طرزِ عمل ان کی نظر میں درست نہیں تھا۔ لہٰذا قوم پرستوں کا یہ بیانیہ کہ امان اللہ خان معصوم تھے اور انھوں نے کسی قسم کی غلطی نہیں کی بلکہ انگریزوں نے سازش کے تحت اقتدار سے الگ کیا، بالکل حقائق پر پردہ ڈالنے کے مترادف ہے۔ حقیقت وہی ہے کہ یہ دراصل روایت اور جدیدیت کی کشمکش تھی، جس میں مذہبی طبقہ روایت جبکہ امان اللہ خان جدیدیت کے علم بردار تھے۔ ممکن ہے کہ امان اللہ خان نیک نیتی کی بنیاد پر یہ سب کچھ کر رہے ہوں، مگر جو کچھ کر رہے تھے غلط کر رہے تھے اور توقع کے مطابق اس کے نتائج ان کے حق میں اچھے نہیں آئے۔

اسی طرح جب سویت یونین نے افغانستان کی سرزمین پر حملہ کیا تو یہاں کے غیور عوام نے اپنی آزادی کے لیے جنگ لڑی اور اس جنگ میں پڑوسی ممالک اور عالمی قوتوں نے بھی افغان عوام کی مدد کی۔ اس مدد اور تعاون کو بنیاد بنا کر قوم پرستوں نے یہ بیانیہ بنایا کہ یہ جنگ افغان عوام کی آزادی کی جنگ نہیں تھی بلکہ امریکہ اور روس کی جنگ تھی۔ اس بیانیے میں بھی یہ قوم پرست کامیاب دکھائی دیتے ہیں اور ہماری نئی نسل بلکہ بہت سے مذہبی لوگ بھی اس بیانیے سے متاثر ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ امیر امان اللہ خان نے جن اصلاحات کا آغاز کیا تھا اور اس کے بعد افغانستان میں جو تعلیمی نظام متعارف ہوا تھا اس نے ایک ایسی نسل تیار کی جو مغربی طرزِ زندگی کی دلدادہ تھی اور اس نسل نے بادشاہت کے بجائے جمہوریت اور سیکیولرازم کا مطالبہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنرل محمد داؤد نے ظاہر شاہ کی حکومت کا خاتمہ کر کے جمہوریت نافذ کی اور پھر نور محمد ترکئی نے کمیونسٹ انقلاب برپا کیا اور حفیظ اللہ امین نے سویت یونین کو افغانستان میں مداخلت کی دعوت دی۔ اس دعوت کو بنیاد بنا کر سویت یونین افغانستان پر حملہ آور ہوا اور اس کے مقابلے میں افغان عوام نے جنگِ آزادی کا آغاز کیا اور بالآخر روس کو پسپا کر دیا، یہ ہے اصل حقیقت۔ ظاہر بات ہے اس جنگ کے ذمے دار بھی یہی سیکیولر، کمیونسٹ حکمران تھے نہ کہ مذہبی رہنما، اس لیے کہ سویت یونین کو مداخلت کی دعوت مذہبی لوگوں نے نہیں دی بلکہ انھوں نے تو اس کا مقابلہ کیا۔ اب اگر امریکہ نے یا کسی اور ملک نے اس میں کردار ادا کیا ہے یا اس سے فائدہ اٹھایا ہے تو صرف اس وجہ سے اسے امریکہ کی جنگ نہیں قرار دیا جا سکتا۔

بالکل یہی طریقۂ واردات قوم پرستوں نے امریکہ اور طالبان کے درمیان جنگ میں بھی اپنایا ہے، ان کا دعویٰ ہے کہ یہ جنگ دراصل پاکستان کی جنگ ہے، پاکستان افغانستان کے خلاف طالبان کو استعمال کرنا چاہتا ہے اور افغان سرزمین پر خون ریزی چاہتا ہے۔ حالانکہ اس میں اصل بات اتنی سی ہے کہ امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا اور طالبان کی حکومت کا خاتمہ کیا تو اس کے مقابلے کے لیے افغان قوم نے جنگ لڑی۔ اب اس جنگ میں کن ممالک اور قوموں کو فائدہ پہنچتا ہے اور کن کو نقصان، اس کا ذمے دار کوئی مخصوص طبقہ نہیں۔ بلکہ یہ تو ہر جنگ کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ یہ اگر بعض قوموں کے حق میں نقصان کا باعث ہوتی ہے تو بعض دیگر کے حق میں اس کے فوائد بھی بہر حال ہوتے ہیں، اس سے تو دنیا کی کوئی جنگ مستثنیٰ نہیں ہے۔ لہٰذا قوم پرستوں کا سازش والا بیانیہ محض ایک فریب ہے، اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اسی طرح یہ سمجھنا بھی از حد ضروری ہے کہ کیا مادی ترقی کے لیے اپنی روایات اور اپنے مذہب سے بغاوت ضروری ہے اور اپنی تہذیب سے روگردانی کیے بغیر مادی ترقی ممکن نہیں ہے؟ اس سوال کو ہم دو طرح سے سمجھنے کی کوشش کریں گے: اوّلاً اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ اگر بالفرض ہماری تہذیب مادی ترقی میں رکاوٹ بن جائے تو کیا ہم اپنی اقدار، روایات اور مذہبی تعلیمات قربان کریں گے اور اس کا اختیار ہمارے پاس ہے؟ ظاہر بات ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہوگا، اس لیے کہ بحیثیتِ مسلمان ہمارے پاس یہ اختیار نہیں ہے، بلکہ اس کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے پاس ہے۔ دوسرے یہ کہ اپنی تہذیب سے بغاوت کیے بغیر کیا ہماری مادی ترقی ممکن ہے؟ اس سوال کا جواب مشاہدے پر مبنی ہوگا کہ کیا جن مسلم ممالک میں جدیدیت کو فروغ دیا گیا اور اپنی تہذیب سے بغاوت کی گئی تو کیا وہاں ترقی ہوئی ہے یا ابھی تک عنقا ہے؟ اس کا جواب بھی واضح ہے۔ ہمارے سامنے ترکی اور کسی نہ کسی درجے میں مصر کی مثالیں ہیں، ترکی نے کمال اتاترک کی قیادت میں اپنی تہذیب سے بغاوت کا فیصلہ کیا اور مشرقی تہذیب کا ایک ایک نشان مٹا ڈالا، مگر ترکی نے اس کے ذریعے کوئی ترقی نہیں کی۔ بلکہ ترکی نے تب ترقی کی جب وہ اپنی تہذیب کی طرف واپسی کے راستے پر ہے۔ اسی طرح مصر میں جدیدیت نے انیسویں صدی میں پنجے گاڑ دیے مگر ابھی تک اس نے قابلِ ذکر ترقی نہیں کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مادی ترقی کا جدیدیت سے بالکل تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ قوموں کے عزم، اپنے نظام کے ساتھ کمٹمنٹ اور خود احتسابی سے

جڑی ہوئی ہے۔ لہٰذا اپنی تہذیب سے بغاوت کرنے میں ترقی ڈھونڈنا اور اس مقصد کے لیے اپنی تاریخ سے رشتہ توڑنا ایک احمقانہ اور غیر دانشمندانہ طرزِ عمل ہے۔

امارتِ اسلامیہ افغانستان: توقعات اور چیلنجز

طویل لڑائیوں اور کئی انقلاب رونما ہونے کے بعد اس وقت افغانستان میں طالبان کی امارتِ اسلامیہ قائم ہے، اس لیے فطری طور پر نہ صرف یہاں کے باشندوں کو بلکہ دنیا میں بسنے والا ہر وہ مسلمان جو مسلمانوں کے سیاسی زوال پر دل گرفتہ ہے، اسے امارتِ اسلامیہ سے بہت سی توقعات ہیں۔ ہر ایک کی خواہش اور دلی آرزو ہے کہ امارتِ اسلامیہ دنیا میں اسلامی عدل و انصاف کی ایک مثال قائم کرے گی اور دنیا کے سامنے اسلامی نظام کا ایک نمونہ پیش کرے گی۔ جبکہ لوگوں کی ان توقعات اور آرزوؤں کے ساتھ امارتِ اسلامیہ کو کئی اندرونی اور بیرونی چیلنجز درپیش ہیں۔ ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ امارتِ اسلامیہ کو عالمی برادری میں اپنا وقار بحال کرنا اور اپنی حکومت تسلیم کرانا ہے، جس میں ابھی تک کوئی قابلِ ذکر پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ اسی طرح اس اہم بیرونی چیلنج کے ساتھ بہت سے داخلی چیلنجز بھی موجود ہیں، ان میں سے ایک معاشی اور اقتصادی چیلنج ہے۔ اس لیے ملک کو معاشی لحاظ سے مستحکم کرنا اور عوام کے معاشی حالات درست کرنا ازحد ضروری ہے تاکہ وہ دنیا میں باوقار حیثیت حاصل کر سکیں۔ کیونکہ جس ملک کی معیشت کمزور ہو وہ دنیا میں برابری کی سطح پر معاملات نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ان چیلنجز میں شاید سب سے زیادہ مشکل چیلنج اپنے عوام اور خاص طور پر نئی نسل کو اعتماد میں لینا ہے۔ اس کی ضرورت اس لیے بہت زیادہ ہے کہ نئی نسل نسبتاً جدید تعلیم سے بہرہ ور ہے اور آزادانہ مزاج کے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہش مند ہے۔ کیونکہ افغان معاشرے میں بدستور ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو جدیدیت سے متاثر ہے اور اس میں قوم پرستانہ خیالات راسخ ہیں، ان کے ساتھ سختی سے پیش آنے کے بجائے نرمی اور حکمت سے پیش آنا ضروری ہے، تاکہ داخلی اختلاف و افتراق اور خلفشار سے بچا جا سکے، کیونکہ داخلی انتشار اور تصادم ملک کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ آج کل عالمِ اسلام کے خلاف عالمی سطح پر سرمایہ دارانہ اور سیکیولر تہذیبی جنگ جاری ہے جس کا ایک پہلو فکری بھی ہے۔ چنانچہ یہ جنگ ہتھیاروں سے نہیں بلکہ قوم کی اصلاح کرنے اور حکمت عملی اپنانے سے جیتی جا سکتی ہے۔ اس معاملے میں امارتِ

اسلامیہ کو موثر تعلیمی نظام تشکیل دینے پر توجہ دینی چاہیے۔ لہٰذا جذبات سے کام لینے کے بجائے موجودہ حالات میں معاشرے کی اصلاح کے لیے سنجیدہ، مثبت اور تعمیری اقدامات کی ضرورت ہے۔

جاری ہے

کتابیات

الكامل في التاريخ (لابن الأثير)

افغانستان د تاریخ په رڼا کی (استاد احمد علی کهزاد)
افغانستان د معاصر تاریخ په رڼا کی (شهسوار سنگر وال)
له احمد شاه بابا سره تر حامد کرزی
د افغانستان تاریخ له اصحابانو ترطالبانو(حانواک مفتی زاده)
د افغانستان پر معاصر تاریخ یوه لنډه کتنه (ډاکټر ابراهیم عطائی)

سیرِ افغانستان (مولانا سید سلیمان ندوی)

تاریخِ افغانستان (مولانا اسماعیل ریحان)

*****

گزشتہ گیارہ شماروں کا اشاریہ

شمارہ نمبر ۱

نعت: شکرِ خدا کہ آج گھڑی اُس سفر کی ہے، مولانا احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ

اداریہ: ایک منثور مرثیہ، مدیر

درسِ قرآن: سورۃ الدہر: آیت ۸، مولانا حماد احمد ترکؔ

درسِ حدیث: دو مسلمانوں میں تفریق کا سبب، ابنِ عباس

مقالات: برکت و تبرکِ رسول ﷺ (۲)، صوفی جمیل الرحمٰن عباسی

بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۶)، صوفی جمیل الرحمن عباسی

یسئلونک: نبی/ولی کے وسیلے سے مانگنا، دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

ادبیات: نظم: ڈھاکہ سے واپسی پر، فیض احمد فیضؔ

نظم: غارت گرانِ خونِ شہیداں حساب دو، مولانا محمد زکی کیفیؔ

غزل: وہ ہم سفر تھا، نصیرؔ ترابی

شمارہ نمبر ۲

نعت: نہ کوئی دل ساغنی ہے نہ کوئی دل سا فقیر، احمد جاویدؔ

اداریہ: سانحۂ سیالکوٹ سے بڑا سانحہ، مدیر

درسِ قرآن: سورۃ النساء آیت: ۱۱۴، مولانا محمد اقبال

درسِ حدیث: بردباری، ابنِ عباس

مقالات: آہ! حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہ

خواطرِ ایام، مفتی اویس پاشا قرنی

بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۷)، صوفی جمیل الرحمن عباسی

یسئلونک: دوسرے شہر میں قصر کا حکم، دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

ادبیات: نظم: اے شعاعِ سحرِ تازہ، احمد فرازؔ

شمارہ نمبر ۳

نعت: کہاں میں کہاں مدحِ ذاتِ گرامی، اقبالؔ عظیم

اداریہ: شجر کاری صدقۂ جاریہ، مدیر

درسِ قرآن: سورۂ یونس، آیت: ۵۷-۵۸، مولانا محمد اقبال

درسِ حدیث: حدیثِ مزارعت، ابنِ عباس

مقالات: حضرت شیخ الاسلام کی تصانیف: تجزیہ و تعارف (۱)، مولانا نایاب حسن قاسمی

بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۸)، صوفی جمیل الرحمان عباسی

سفرنامۂ ترکی (۱)، مولانا حماد احمد ترکؔ

یسئلونک: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سماعِ صلاۃ وسلام کے حوالے سے اہلِ سنت والجماعت کا موقف، دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

ادبیات: آو قافی علامات، نصیرؔ ترابی

نظم: اے وادیٔ کشمیر، شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہ

شمارہ نمبر ۴

نعت: لوح بھی تُو، قلم بھی تُو، علامہ اقبالؔ

ادار یہ: رمضان: نیکیوں اور مغفرت کا مہینا، مدیر

درسِ قرآن: ماہِ صیام اور قرآن، مولانا محمد اقبال

درسِ حدیث: استقبالِ رمضان، ابنِ عباس

مقالات: حضرت شیخ الاسلام کی تصانیف: تجزیہ و تعارف (۲)، مولانا نایاب حسن قاسمی

بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۹)، صوفی جمیل الرحمان عباسی

سفرنامۂ ترکی (۲)، مولانا حماد احمد ترکؔ

امام غزالی علیہ الرحمۃ کی تصوف پر تصنیفات کا جائزہ (۱)، محمد عثمان خان

یسئلونک: رخصتی سے قبل ولیمہ کرنے کی شرعی حیثیت، دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

ادبیات: سیرت النبی ﷺ پر چند غیر منقوط کتب، تبسم فاطمہ

غزل: تھا جانبِ دل صبح دم، احمد جاویدؔ

شمارہ نمبر ۵

نعت: غلاموں کو سریرِ سلطنت پر جس نے بٹھلایا، حفیظؔ جالندھری

ادار یہ: اے خیر کے طالب...، مدیر

درسِ قرآن: ماہِ صیام میں قیام اللیل کی اہمیت و فضیلت، مولانا محمد اقبال

درسِ حدیث: رمضان المبارک کی برکتیں، ابنِ عباس

مقالات: حضرت شیخ الاسلام کی تصانیف: تجزیہ و تعارف (۳)، مولانا نایاب حسن قاسمی

بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۱۰)، صوفی جمیل الرحمان عباسی

سفرنامۂ ترکی (۳)، مولانا حماد احمد ترکؔ

امام غزالی علیہ الرحمۃ کی تصوف پر تصنیفات کا جائزہ (۲)، محمد عثمان خان

یسئلونک: منکرینِ حدیث، دارالافتاء، فقہ اکیڈمی
ادبیات: نظریاتی ریاست میں ادیب کا کردار (۱)، سلیم احمد
نظم: قرآن کی فریاد، ماہر القادری

شمارہ نمبر ۶

نعت: مرا پیمبر عظیم تر ہے، مظفر وارثی
اداریہ: اعمالِ صالحہ پر دوام، مدیر
درسِ قرآن: نیکی کے کاموں پر مداومت، مولانا محمد اقبال
درسِ حدیث: شوال کے چھے روزے: ابنِ عباس
مقالات: عشرۂ ذوالحجہ اور عیدالاضحیٰ: فضائل و مسائل (۱)، مفتی اویس پاشا قرنی
بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۱۱)، صوفی جمیل الرحمان عباسی
سفرنامۂ ترکی (۴) مولانا حماد احمد ترک
مقالات امام غزالی علیہ الرحمۃ کی تصوف پر تصنیفات کا جائزہ (۳) محمد عثمان خان
یسئلونک: فوت شدہ روزوں کا فدیہ، دارالافتاء، فقہ اکیڈمی
ادبیات: نظریاتی ریاست میں ادیب کا کردار (۲)، سلیم احمد

شمارہ نمبر ۷

نعت: عشق کے رنگ میں رنگ جائیں جب افکار، ادیب رائے پوری
اداریہ: حاجیوں سے کچھ باتیں، مدیر
درسِ قرآن: قربانی کی مشروعیت اور فلسفہ، مولانا محمد اقبال

درسِ حدیث: نفلی حج، ابنِ عباس

مقالات: عشرۂ ذوالحجہ اور عید الاضحیٰ: فضائل و مسائل (۲)، مفتی اویس پاشا قرنی

بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۱۲)، صوفی جمیل الرحمان عباسی

سفرنامۂ ترکی (۵)، مولانا حماد احمد ترکؔ

دارالعلوم دیوبند کی خدمات، مولانا غلام اللہ خان رحمۃ اللہ علیہ

یسئلونک: دورانِ حج مکہ میں نمازِ قصر، دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

ادبیات: نظم: مشرق ہار گیا ہے، سلیمؔ احمد

شمارہ نمبر ۸

نعت: ہمیں جو یاد مدینے کا لالہ زار آیا، ساغرؔ صدیقی

اداریہ: سود، مدیر

درسِ قرآن: دعا کی اہمیت اور آداب، مولانا محمد اقبال

درسِ حدیث: پانچ برائیاں: پانچ عذاب، ابنِ عباس

مقالات: تفسیرِ قرآن کے آداب (۱)، مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمۃ اللہ علیہ

بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۱۳)، صوفی جمیل الرحمان عباسی

سفرنامۂ ترکی (۶)، مولانا حماد احمد ترکؔ

یسئلونک: قرض دار پر قربانی، دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

ادبیات: علاوہ اور سوا کا استعمال، احمد حاطبؔ صدیقی

شمارہ نمبر ۹

نعت: آپ کی نعت کیا کہوں؟، حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

اداریہ: آہ اے ارضِ وطن، مدیر

درسِ قرآن: علم اور اہلِ علم کا مقام اور ذمے داریاں، مولانا محمد اقبال

درسِ حدیث: کامیاب انسان کے اوصاف، ابنِ عباس

مقالات: تفسیرِ قرآن کے آداب (۲)، مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمۃ اللہ علیہ

بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۱۴)، صوفی جمیل الرحمان عباسی

سفرنامہ ترکی (۷)، مولانا حماد احمد ترک

یسئلونک: روایت ''حب الوطن من الایمان'' کی تحقیق، دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

ادبیات: نظم: خدا کرے کہ میری ارضِ پاک پر اترے، احمد ندیم قاسمی

رحلات: افغان نامہ (۱)، مفتی اویس پاشا قرنی

شمارہ نمبر ۱۰

نعت: حضور ایسا کوئی انتظام ہو جائے، سید صبیح الدین صبیح رحمانی

اداریہ: توبہ اور خدمت، مدیر

درسِ قرآن: جذبۂ ایثار: اسلامی معاشرے کی اہم خصوصیت، مولانا محمد اقبال

درسِ حدیث: المسلم اخو المسلم، ابنِ عباس

مقالات: کتابوں کی خریداری سے آتی ہے مال داری، مفتی نثار احمد مصباحی

بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۱۵)، صوفی جمیل الرحمان عباسی

اسکول بحیثیت ادارہ، فرید بن مسعود

سفرنامہ ترکی (۸)، مولانا حماد احمد ترک

یسئلونک: راشن مہم وغیرہ میں زکوٰۃ کی رقم دینا، دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

ادبیات: ادھوری جدیدیت (۱)، سلیم احمد

رحلات: افغان نامہ (۲)، مفتی اویس پاشا قرنی

شمارہ نمبر ۱۱

نعت: مدینے کا سفر ہے، اقبال عظیم

اداریہ: ٹرانس جینڈر ایکٹ، مدیر

درسِ قرآن: اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے اوصاف، مولانا محمد اقبال

درسِ حدیث: تبدیلیٔ جنس: لعنت زدہ فعل، ابنِ عباس

مقالات: بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۱۶)، صوفی جمیل الرحمان عباسی

صنفی شناخت کی پالیٹیکل اکانومی، فرید بن مسعود

سفر نامہ ترکی (۹)، مولانا حماد احمد ترک

کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے، صوفی جمیل الرحمان عباسی

فقہیات: القواعد الفقہیہ: القاعدۃ الرابعۃ، مفتی نذیر احمد ہاشمی

یسئلونک: عید میلاد النبی ﷺ، دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

ادبیات: ادھوری جدیدیت (۲)، سلیم احمد

رحلات: افغان نامہ (۳)، مفتی اویس پاشا قرنی

* * * * *